# یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

## فاروق نازکی


مرتبین

ڈاکٹر لیاقت جعفری

ڈاکٹر محمد سلیم وانی

عمر فرحت

# یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

فاروق نازکی

# یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

## فاروق نازکی

مرتبین :

ڈاکٹر لیاقت جعفری، ڈاکٹر محمد سلیم وانی

عمر فرحت

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

# YEH DHUAN SA KAHAN SE UTHTA HAI

by: Farooq Nazki

Edited by

Dr. Liaqat Jafri, Dr. Md. Salim Wani

Umar Farhat

Year of Edition 2018
ISBN 978-93-87829-21-3
Price Rs. 600/-

نام کتاب : یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے (شعری انتخاب)
شاعر : فاروق نازکی
مرتبین : ڈاکٹر لیاقت جعفری، ڈاکٹر محمد سلیم وانی، عمر فرحت
موسم اشاعت : فروری ۲۰۱۸ء
قیمت : ۶۰۰ روپے
سرورق : تفہیم
زیر اہتمام : تفہیم پبلی کیشنز، راجوری، جموں و کشمیر (انڈیا)
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

**تقسیم کار**

- شب خون، کتاب گھر، الہٰ آباد (یوپی)
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ (یوپی)
- بک کارنر، جہلم (پاکستان)
- تفہیم پبلی کیشنز، راجوری (جموں کشمیر)

*Published by*

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

درندے جنگلوں میں اب نہیں رہتے

مجھے معلوم ہے لیکن

جو بچے جنگلوں کی اور جاتے ہیں

واپس کیوں نہیں آتے ؟

امجد اسلام امجد

اور

کشور ناہید

کے نام

# غزلیات

اک آن سمندر کے تلاطم میں گھِرا ہے
اک آن سمندر کے کنارے پہ کھڑا ہے

مضمون ہے یا صورتِ عنوان نما ہے
وہ پردۂ معنیٰ میں بدستور چھپا ہے

معلوم نہیں مجھ کو کہ وہ کون ہے کیا ہے
اُس شخص کا انداز مگر سب سے جدا ہے

ہر چند رہا ساتھ مرے سائے کی مانند
وہ شخص اشارہ نہ ادا ہے نہ صدا ہے

کل رات اکیلے میں مرے کان میں بولا
وہ غیر نہیں آج کے انسان کا خدا ہے

ہم نے تو کوئی بات نرالی نہیں دیکھی
کہتے ہیں کہ فاروق کا انداز جدا ہے

☆☆

وقت کو جن پہ کبھی ناز رہا ، ہم ہی تھے
وقت بے وجہ جنہیں بھول گیا ، ہم ہی تھے

وہ جو اترے تھے سرِ شام کبھی آنگن میں
چاندنی رات میں دینے کو صدا ، ہم ہی تھے

بجلیاں جن کے نشیمن سے بہت جلتی تھیں
جن پہ اِتراتی رہی موجِ ہوا ، ہم ہی تھے

اپنی دیوارِ بدن ہم سے کبھی سر نہ ہوئی
ساتھ رہ کر جو رہے خود سے جدا ہم ہی تھے

عین واجب ہے اگر اس کی سزا ہم کو ملی
یہ حقیقت ہے گنگارِ وفا ، ہم ہی تھے

کیا جنوں خیز تھا فاروقؔ وہ پچھلا موسم
عشق میں سب سے فزوں سب سے سوا، ہم ہی تھے

یونہی کرلیتے ہیں اوقات بسر اپنا کیا؟
اپنے ہی شہر میں ہیں شہربدر اپنا کیا ؟

رات لمبی ہے چلو غیبتِ یاراں کرلیں
شب کسی طور تو ہو جائے بسر اپنا کیا؟

دوریاں، فاصلے، دشوار گذر گاہیں ہیں
ہے یہی شرطِ سفر ، رختِ سفر اپنا کیا

تجھ سے اب اذنِ تکلم بھی اگر مل جائے
لب ہلیں یا نہ ہلیں ، آنکھ ہو تر اپنا کیا

جام پھر تازہ کرو ، رات بہت لمبی ہے
کچھ تو کرنا ہے میاں تابہ سحر ، اپنا کیا

وہ جو فاروقؔ کا مسکن تھا کنارہ دریا
اب وہاں پر ہے کھڑا ریت کا گھر، اپنا کیا

☆☆

چاندنی آسمان سے اترے گی
میرے آنگن سے ہوکر گذرے گی

رات، جنگل، مہیب سناٹا
اب یہاں تیرگی ہی اترے گی

بہتے پانی پہ کس نے لکھا ہے
ناو کاغذ کی پار اترے گی

بوئے گل بن کے جب تو آجائے
دشت میں بھی بہار اترے گی

بات تیشہ نہیں مگر پھر بھی
بات پتھر کے دل میں اترے گی

کب یہ سوچا تھا تیری صحبت میں
شخصیت نازکی کی نکھرے گی

☆☆

باسی شبدوں کے پیکر
گاڑو مٹی کے اندر

جھوٹی باتوں کی اترن
بکتی ہے چوراہے پر

چہرہ مہرہ خال و خط
تصویروں کے خالی گھر

طوفانوں کی آمد ہے
پنچھی لوٹ رہے ہیں گھر

لکھ دے سب کچھ میرے نام
دریا، طوفان اور بھنور

☆☆

اپنا معاملہ بھی جہاں میں عجب رہا
عہدِ شباب بھی پسِ دیوار شب رہا

اک اپنی ذات تھی جو فراموش ہوگئی
باقی جو زندگی نے دیا یاد سب رہا

تم پر عنایتوں کی ضیا پاشیاں ہوئیں
ہم پر تمام عمر غضب ہی غضب رہا

اپنے نگر میں گمشدگاں میں شمار تھے
پھر بھی خیال گھر کا ہمیں بے سبب رہا

دریائے خونِ خلق میں تیرے گا آدمی
اس کا خیال اس کا گماں کس کو کب رہا

برگِ چنار اب کے حنا سے تہی رہے
رنگِ خزاں بھی اب کے برس کچھ عجب رہا

اے شہرِ بامراد ترے بانکپن کی خیر
ہم پر تری بہار کا سایہ ہی کب رہا

کمالِ عجز ہی جس کا کمال ٹھہرا ہے
مری نگاہ میں وہ لازوال ٹھہرا ہے

یہ لوگ ذہن میں کانٹے بچھائے بیٹھے ہیں
اگر چہ پھول ہی وجہ سوال ٹھہرا ہے

وہ لاجواب تھا ہم کو جواب کیا دیتا
ہمارے ہونٹوں پر آ کر سوال ٹھہرا ہے

اُسی نے سب کے رگ و پے میں زہر گھول دیا
وہ ایک شخص جو شیریں مقال ٹھہرا ہے

صبا کی طرح وہ خانہ بدوش سیرت ہے
کسی مقام پہ وی خال خال ٹھہرا ہے

وہ شخص میرے بدن کی زباں سمجھتا ہے
سکوتِ جس کا کہ حسن کمال ٹھہرا ہے

ہنر یہی تو ہے فاروق نازکیؔ تیرا
کہ بے ہنر ہے مگر باکمال ٹھہرا ہے

رنگوں کی گہرائی کا
جھگڑا سب بینائی کا

مجھ کو مجھ سے دور کیا
نام نہ لو ہر جائی کا

یہ موسم کب لگتا ہے
شوخی کی رعنائی کا

بے خوابی ہی بے خوابی
حرجانہ تنہائی کا

یہ تو ایک کہاوت ہے
بھائی دشمن بھائی کا

☆☆

کون کہتا ہے تیری بزم سے باہر ہوں میں
جھانک کر دیکھ تیرے سینے کے اندر ہوں میں

میں تیرے نام کی مانند جڑا ہوں تجھ سے
تو کنارا ہے مگر تیرا سمندر ہوں میں

اس میں جز لشکر اخلاص نہیں کوئی مکیں
مملکت دل کی ہے اور اس کا سکندر ہوں میں

کس طرح روک سکوں دستِ جفا کیش بتا
دست مجبور میں ٹوٹا ہوا خنجر ہوں میں

تو مجھے بھیڑ میں پہچان سکے گا کیسے
اپنی پرچھائیں سے چھوٹا ہوا پیکر ہوں میں

☆☆

یہ آسمان ابر سے گھِرا ہے
زمین کا سینہ تنا ہوا ہے

نظر کی سرحد سے کیوں چھپا ہے
جو مجھ کو رستہ دکھا گیا ہے

نہ کوئی سایہ ، نہ کوئی چشمہ
یہ قافلہ کیوں یہاں رُکا ہے

سویرے اُٹھتا تو دِیکھ لیتا
کہ اک ستارا سحر نما ہے

نہ مجھ پہ سایہ کسی شجر کا
نہ میرے سر پر کوئی ردا ہے

قدم قدم پر ہے موت رقصاں
میں جی رہا ہوں تیری دعا ہے

تمہاری دنیائے آب و گل میں
ہر اک موسم گریز پا ہے

بھٹک گیا جو راستے سے
وہ میرا رہبر ہے رہنما ہے

سنے تو کیسے سنے زمانہ
ہماری آواز بے صدا ہے

☆☆

یہ کس گماں میں آکر مرا یقیں ٹھہرا
یہ اور بات میرا امتحاں نہیں ٹھہرا

فضا تو صاف بتاتی تھی ، باڑھ آئے گی
ہر اک مکان میں پھر بھی ہر اک مکیں ٹھہرا

نہ احتیاط نہ تدبیر کوئی کام آئی
وہ جس پہ تکیہ کیا مارِ آستیں ٹھہرا

جہاں گماں گزرتا ترے آنے کا
دلِ غریب بھی شاید وہیں کہیں ٹھہرا

میرے قریب رہا یا کہ مجھ سے دور رہا
ہر ایک حال میں وہ شخص دل نشیں ٹھہرا

☆☆

افسوس یہ نہیں کہ گلِ تر نہیں آئے
صد شکر ہے ، جواب میں پتھر نہیں آئے

پاسنگ میں تلوار بھی ڈالی تھی و لیکن
دو ہاتھ ترازو کے برابر نہیں آئے

سیلاب کے ڈر سے جو پہاڑوں میں چھپے تھے
وہ لوگ پہاڑوں سے اتر کر نہیں آئے

ایجاد کے اس دور کا ایک اور کرشمہ
آنے کو سبھی آئے پیمبر نہیں آئے

جس راہ پہ نکلے تھے اسی پر رہے قائم
ایسا نہیں کہ سامنے پتھر نہیں آئے

گلشن میں کئی پیڑ ابھی تک ہیں سلامت
اب کے ہوا کے ہاتھ میں خنجر نہیں آئے

☆☆

یوں قاتل کا نام نہ لے
اپنے سر الزام نہ لے

قسمیں، رسمیں، پاس، لحاظ
ان حربوں سے کام نہ لے

نیکی کر دریا میں ڈال
بدلے میں انعام نہ لے

پچھلی رُت کا حال سنا
اس موسم کا نام نہ لے

سات سمندر کا ہے سفر
سست روی سے کام نہ لے

☆☆

مجھ کو اسیرِ حلقہ زندان کر گیا
کیا خوب میری زیست کا سامان کرگیا

باہر سے جو بھی آیا پریشان کرگیا
ہم کو ہمارے گھر میں ہراسان کرگیا

ناگر نگر وہ تیری مطلّا عمارتیں
معمار میرے عہد کا ویران کرگیا

جاتی رہی چنار کے پتوں کی سرخیاں
جاڑے کا زور شہر کو ویران کرگیا

گردن پہ اس کے یوں تو ہزاروں کا خون تھا
ماتھے پہ میرے داغ جو چسپاں کرگیا

آنکھیں تلاش کرتی رہیں خواب میں جسے
فاروقؔ تیری مشکلیں آسان کرگیا

☆☆

کہتے ہیں کہ فاروق وفادار بہت ہے
اس واسطے ہر شخص سے بیزار بہت ہے

یہ شہر بھی کیا خوب ہے اس شہر میں کوئی
سچ بول کے جی لے تو خطا کار بہت ہے

بے خوابی و بیداری شب تم کو مبارک
ہم کو تو ہمارا دلِ بیدار بہت ہے

اے موجِ صبا در پہ میرے ہلکی سی دستک
یہ رات شرر بار شرر بار بہت ہے

دامانِ نظر تنگ ہے کیا جلوے سمیٹوں
مفلس کے لئے رونقِ بازار بہت ہے

☆☆

تہمت سیرِ چمن ہم پہ لگی کیا نہ ہوا
طبعِ آزاد میں زنجیر پڑی ، کیا نہ ہوا

وہ الم دوست تھے ہم جن کی ہر اک موسم میں
دیکھتے دیکھتے خوشیوں سے ٹھنی ، کیا نہ ہوا

خواب تو خواب رہے، نیند بھی آنے سے رہی
گردِ بیداریٔ شب مُنہ پہ ملی کیا نہ ہوا

سینۂ برگِ گل تر پہ نظر تھی اپنی
زندگی آگ کے سانچے میں ڈھلی کیا نہ ہوا

ہم تو کیا چیز تھے اس شہر کے ہنگاموں میں
اہلِ دانش کی کہاں پیش چلی کیا نہ ہوا

☆☆

نیند میری ہے، خواب میرے ہیں
کہکشاں، ماہتاب، میرے ہیں

چاندنی اوڑھ لی ہے اب میں نے
یہ دھنک ، یہ سحاب میرے ہیں

بھیگے موسم کی خوش ہوا تیری
پیاس میری، سراب میرے ہیں

دھوپ موسم ہو یا زمستاں رُت
میرے غم ہمرکاب میرے ہیں

تتلیوں کا ہجوم میرا ہے
مسکراتے گلاب میرے ہیں

ہجر کے روز و شب ، ملن کے پل
تیرے کھاتے ، حساب میرے ہیں

آگہی کے فلک پہ تابندہ
سیکڑوں آفتاب میرے ہیں

چند خوشیاں ہیں آپ کی فاروقؔ
غم مگر بے حساب میرے ہیں

☆☆

مُدام ساغر کے پاس رہنا
مگر سبو ناشناس رہنا

ہماری عادت سی بن گئی ہے
کسی سبب سے اداس رہنا

ہمیں تو اب اضطراب میں بھی
بُرا لگے بدحواس رہنا

یقیں کی شمعیں جلا بجھا کر
شریک بزمِ قیاس رہنا

یہ شب بہت معتبر نہیں ہے
جو ہوسکے آس پاس رہنا

جوان موسم کی شاہزادی!
شجر شجر بے لباس رہنا

☆☆

پورے قد سے میں کھڑا ہوں سامنے آئے گا کیا
میں تیرا سایہ نہیں ہوں مجھ کو سمجھائے گا کیا

آندھیوں پر اُڑ رہا ہے جن پرندوں کا ہجوم
آسماں کی وسعتوں سے لوٹ کر آئے گا کیا

اِک نئے منظر کا خاکہ آسماں پر کیوں نہیں
چاند اپنی چاندنی پر یونہی اِترائے گا کیا

فصلِ گُل کے بعد پت جھڑیوں تو اِک معمول ہے
خوف بن کر پھر در و دیوار چھائے گا کیا

جانب ِ شہرِ غزالاں پھر چلی شامِ فراق
دشت کی بے خوابیوں کا رازداں آئے گا کیا

درد کے کالے سمندر کی تلاطم خیزیاں
روک دے گا کوئی منظر نور برسائے گا کیا

خون کی روتی سفیدی ، بے صدا سازوں کا شور
بے سروپا گیت کوئی بے زبان گائے گا کیا

ہے غزل آزاد گویا ، بے درو دیوار گھر
ہم کو بھی اس صنفِ تازہ کا ہنر آئے گا کیا

☆☆

نزع کی سی کیفیت طاری ہوئی
تیز دھڑکن سانس کچھ بھاری ہوئی

حبسِ بے جا کس طرح ثابت کریں
رات منصف کی گرفتاری ہوئی

پہلے لاشوں کا کیا کچھ انتظام
بعد میں شب خوں کی تیاری ہوئی

خون میں تر لاش پر گل رکھ دئے
یہ تو دلداری ہی دلداری ہوئی

جب لہو کے دیپ روشن ہو گئے
بام و در سے جوئے خوں جاری ہوئی

ہے یوں کی عیادت کی زباں اور ہے کوئی
احوالِ واقعی کا بیاں، اور ہے کوئی

بجلی کے نام کردئے، خوابوں کے نشیمن
ہم سا چمن فروش کہاں اور ہے کوئی

میں جس کو ڈھونڈتا ہوا آیا تھا یہاں تک
وہ شخص جا چکا ہے یہاں اور ہے کوئی

صحرا سے جو قریب تھا یہ وہ تو نہیں ہے
دریا بدن میں میرے رواں اور ہے کوئی

آئی بہار خوں میں نہاتی ہوئی مگر
پھر بھی تو کہہ رہا ہے خزاں ، اور ہے کوئی

☆☆

نقش بر آب اپنی ہستی ہے
ہائے کیا پائیدار ہیں ہم بھی

کچھ تو موسم بھی ہے اداس اداس
اور کچھ بے قرار ہیں ہم بھی

کوئی خواہش نہ آرزو باقی
چاہتوں کا غبار ہیں ہم بھی

دبکے بیٹھے ہیں بند کمروں میں
واقعی جاں نثار ہیں ہم بھی

پھول ہر سو کھلے تو یہ جانا
دل جلوں میں شمار ہیں ہم بھی

☆☆

کبھی افلاک پر چلنا ، کبھی پاتال میں رہنا
مجھے اچھا نہیں لگتا ہے اب اس حال میں رہنا

خدارا مجھ کو گہرے پانیوں سے اب خلاصی دو
کہاں تک مجھ کو اب گرداب میں یا جال میں رہنا

ہماری عورتوں کے جو بھی گُن ہیں ایک یہ بھی ہے
کسی کی موت پر نوحہ کناں سر تال میں رہنا

محبت روگ ہے اس روگ کا درماں کرے کوئی
بہت مشکل ہے اب اس عشق کے جھنجال میں رہنا

☆☆

کاغذی پیرہن میں ہے ماحول
ہم بھی اوڑھیں لباس لفظوں کا

نظریں اب کچھ نہیں سناتی ہیں
ہم ہیں اور آس پاس لفظوں کے

ایک گونگا ملا تھا بستی میں
جو تھا معنی شناس لفظوں کا

گھر سے نکلے تو ایک صحرا میں
ہم نے ڈالا نواس لفظوں کا

حامدؔی کی طرح بنائیں گے
کوہ پر اک نواس لفظوں کا

☆☆

وہ خوش دماغ تھا خوشبو میں ڈھل گیا ہوگا
نظر نواز تھا ، منظر بدل گیا ہوگا

صبا کی نرم روی تھی سرشت میں اس کی
عجب نہیں کہ وہ پتھر میں ڈھل گیا ہوگا

فریب خوردہ مناظرِ سے ادب کروہ بھی
گھنیری چھاؤں میں ممکن ہے جل گیا ہوگا

وہ دھوپ دشت کا پالا ہوا مسافر تھا
جبینِ خاک پہ سورج کو مل گیا ہوگا

بہت دنوں سے مقید تھا اپنے کھوکھلے میں
حدودِ ذات سے باہر نکل گیا ہوگا

بلندیوں سے لڑھک کر زمیں پہ آیا تھا
بعید کیا ہے وہ گر کر سنبھل گیا ہوگا

☆☆

خوشی کے بھیس میں جب غم شمار ہوتا ہے
لباس عمر رواں تار تار ہوتا ہے

ہزاروں لفظ چھلکتے ہیں پھر نگاہوں سے
کسی خیال کا جب انتظار ہوتا ہے

اکیلے ہم نہیں ہوتے تیری جُدائی میں
ہمارے ساتھ دلِ بے قرار ہوتا ہے

تمام رات دریچے پہ چاند رُکتا ہے
تمہارے آنے کا جب اعتبار ہوتا ہے

چمن سے یونہی گذرتا ہے تتلیوں کا ہجوم
دلِ خراب پہ کب اختیار ہوتا ہے

ہو وقت اچھا تو سود و زیاں میں فرق نہیں
بُرا ہو وقت تو ٹھپ کاروبار ہوتا ہے

☆☆

سخن میں اک سنہرا باب، لکھنا
غزل کو گوہرِ نا یاب، لکھنا

گلوں کی آگ میں شبنم کے موتی
سحر کو صورت سیماب، لکھنا

اگر وادی کا پوچھے حال کوئی
ہوئی ہے خوں سے سیراب، لکھنا

وہی سخن ور ہے مہرِ رخشاں
سمجھ کر، سوچ کر، القاب، لکھنا

وطن سے بے وطن اردو ہوئی کیوں ؟
تکلف بر طرف اسباب، لکھنا

☆☆

اُسے تو موت کا بھی ڈر نہیں ہے
اگرچہ آدمی خود سر نہیں ہے

تمہارے شعر کیسے یاد رکھیں
مجھے اپنا کہا، از بر نہیں ہے

جہاں دن رات پورے کررہا ہوں
مکاں اس کا ہے میرا گھر نہیں ہے

یہ کیسی فصلِ گل آئی ہے اب کے
کسی کے ہاتھ میں پتھر نہیں ہے

چلو اُس پیڑ کے چھاوں میں بیٹھیں
ہوا کے ہاتھ میں خنجر نہیں ہے

بدن میرا ہے، اس میں شک نہیں ہے
میرے کاندھوں پہ میرا سر نہیں ہے

☆☆

وہ جس کا چہرہ گلاب جیسا، ثبات ہے جس سے رنگ و بو میں
تھکن سی لہجے میں چاندنی کی، صبا کا انداز گفتگو میں

بدن میں چاندی کے دائرے تھے، لباس کہرا تھا خوشبوؤں کا
ہزاروں تارے جبیں پہ روشن، چمک دھمک اُس سے کاخ و کُو میں

میری نظر میں اتر گئی وہ سمٹ گئی میرا خواب بن کر
ہر ایک لمحہ قریب میرے، رچی بسی ہے میرے لہو میں

نہ کوئی لفظوں کی بھیڑ ہی تھی، نہ کوئی وقفہ تھا درمیاں میں
جہانِ معنی سمٹ گیا تھا، ہماری خاموش گفتگو میں

وہ میری سانسوں میں بج رہا ہے، وہ میرے دل میں دھڑک رہا ہے
عجیب عالم ہے، اس کی خاطر بھٹکتا پھرتا ہوں کو بکو میں

☆☆

رات سوچا تھا خواب میں تم کو
صبح دیکھا گلاب میں تم کو

دن کو ہر اک کرن میں تم ہی تم
شام دیکھا شراب میں تم کو

یاد سب خال و خط تمہارے ہیں
پڑھ لیا تھا کتاب میں تم کو

میں تو خود ہی سوال بن بیٹھا
کیسے لکھتا جواب میں تم کو

منچلے عاشقوں نے اب کی بار
لکھ دیا ہے نصاب میں تم کو

وہ جو لگتا ہے وہ نہیں فاروقؔ
ڈال دے گا عذاب میں تم کو

☆☆

# سائیں غزل

پیلی مٹی ماتھے پر چپکائے گا
سائیں بن کر خود سے وہ شرمائے گا

اس کی تو زنبیل میں ساری دنیا ہے
بنجارا ہے پھر بھی گھر گھر جائے گا

دھرتی پوجا کرنے والے من موجی
پہلی بارش لے کر پھر کب آئے گا

سائیں سائیں کرتی رات کے دامن پر
بھیگی صبح کا پرچم کب لہرائے گا

☆☆

# غزل اندر غزل

تو کہتا ہے اچھا لکھ
میں کہتا ہوں اپنا لکھ

لاکھوں دولہے قبرستان
نوحہ لکھ یا سہرا لکھ

خون میں لت پت وادی ہے
کوئی شعر سُہانا لکھ

اب بھی ہے تیرے گھر میں
اس کا آنا جانا لکھ

اردو کی کچھ خدمت کر
علوی فلمی گانا لکھ

میں کب کہتا ہوں تم سے
ایسا لکھ یا ویسا لکھ

اگلے خط میں بھر خدا
اپنا ٹھور ٹھکانا لکھ

ساغر لکھ، مے خانہ لکھ
محفل لکھ، پروانہ لکھ

دریا دریا معنی کا
شعروں میں پیمانہ لکھ

لیلیٰ مجنوں بن جائے
ایسا اک افسانہ لکھ

اتنا پتا کیا پوچھو ہو
صحرا لکھ، ویرانہ لکھ

میرؔ کی دھیمی لے اپنا
غالبؔ کا سا نامہ لکھ

اب بھی بند پڑا ہے کیا
نکڑ کا مے خانہ لکھ

ملتا تو ہوگا فاروقؔ
کیسا ہے، دیوانہ لکھ

☆

اپنی صورت لگتی ہے
تھوڑی سی بیگانی لکھ

دن پر بھی چھا جاتی ہے
راتوں کی ویرانی لکھ

اب بھی اس کی کایا کیا
لگتی کچھ ہے دھانی لکھ

موت کی وادی میں اب بھی
آتے ہیں سیلانی لکھ

ہاری پربت پر کوئی
پڑھتا ہے گربانی لکھ

مسجد سے کیا آتی ہے؟
کوئی صدا ربانی لکھ

کیا یہ سچ ہے جھیلوں کا؟
بدل گیا ہے پانی لکھ

مائیں اب بھی دیتی ہیں
بچوں کی قربانی لکھ

رانی آدم خور ہے کیا؟
شہر کا راجہ زانی لکھ

اشکوں کی تابانی سے
غزل کوئی ''دردانی'' لکھ

کرب و بلا کے ہونٹوں پر
دریا کی طغیانی لکھ

جس میں سب کچھ بہہ جائے
ایک غزل طوفانی لکھ

اب بھی رنگ بدلتی ہے
اپنی کھیر بھونی لکھ

کس کس کا اب باقی ہے
شہر میں دانا پانی لکھ

☆

تجھ پر بھی الہام ہوا
تنہائی کے غار میں لکھ

اپنوں سے ڈر لگتا ہے
مجھ کو بھی اغیار میں لکھ

زندوں کو بھی چھوڑ آئے
لاشوں کے انبار میں لکھ

کتنی گرمی باقی ہے
دل کے کاروبار میں لکھ

میرے صورت گر کا نام
چاندی کی دیوار میں لکھ

اپنا چہرہ اپنا نام
شیشے کی دیوار میں لکھ

جھلمل تاروں کی چھم چھم
پایل کی جھنکار میں لکھ

سچی خبریں رہنے دے
افواہیں اخبار میں لکھ

تو اندر سے باہر آ
آزادی اظہار میں لکھ

لوح و قلم کا مالک تو
سکھ ہی سکھ سنسار میں لکھ

☆☆

مانتا ہوں بحث کی کوئی بھی گنجائش نہ تھی
وقت ہی ایسا تھا، دل میں کوئی بھی خواہش نہ تھی

روبرو تھے، اور ہم کو دیکھتے تھے غور سے
اُن کی آنکھوں، اُن کے ہونٹوں کو مگر جنبش نہ تھی

خشک پتوں کی زباں پر العطش کا ورد تھا
آسماں پر ابر چھایا تھا، مگر بارش نہ تھی

ایسی تاریکی کہ سارا شہر غائب ہوگیا
گھر جلا کر روشنی کرنے کی گنجائش نہ تھی

یک بیک ساری عمارت اِک دھماکے سے گری
لوگ کہتے ہیں کہ یہ تقدیر کی سازش نہ تھی

تھے کئی خوش بخت، جن پر تھی عنایت کی نظر
اپنے حصے میں عنایت کیا؟ کبھی رنجش نہ تھی

☆☆

نازکی کا مسئلہ کچھ بھی نہیں
اک سخنور کا گلہ کچھ بھی نہیں

نقطۂ آغاز ہی انجام ہے
سلسلہ در سلسلہ کچھ بھی نہیں

آگ سینے میں فروزاں ہوگئی
دل جلانے کا صلہ کچھ بھی نہیں

ہم نے بھی سر توڑ کوشش کی مگر
شومیٔ قسمت ملا کچھ بھی نہیں

میرے جو کچھ پاس تھا وہ لے لیا
میں نے جب مانگا دیا کچھ بھی نہیں

آیئے اب صلح کی کوشش کریں
احتجاجوں سے ملا کچھ بھی نہیں

ساتھ طوفاں کے رہے گی دوگھڑی
پانی اترے تو ہوا کچھ بھی نہیں

شہر خالی ہوگیا فاروقؔ جی
آپ کہتے ہیں ہوا ، کچھ بھی نہیں

سوچ لو تو بات کچھ گھمبیر ہے
سوچ لو تو ماجرا کچھ بھی نہیں

☆☆

میرے آنکھوں سے وہ پردے کو ہٹا ہی دے گا
اپنی نظروں میں کبھی مجھ کو چھپا ہی دے گا

کب تلک ساتھ رہے گا وہ اسی طرح بتا
درمیاں میں کوئی دیوار اٹھا ہی دے گا

فصلِ گل آتی ہے دیونے کو زنجیر کرو
ورنہ گلشن کو سرِ عام جلا ہی دے گا

حادثہ ہی تھا جسے نام جدائی کا ملا
حادثہ ہی کوئی پھر ہم کو ملا ہی دے گا

اپنی آغوش میں جب مجھ کو سمندر لے گا
سارا جھگڑا یہ من و تو کا مٹا ہی دے گا

آج کل چپ ہے نہ کہتا ہے نہ لکھتا فاروقؔ
شعر موزون کرے گا تو سنا ہی دے گا

☆☆

تیرے پیرہن کو اگر کانگڑی جلائے گی
یہ آگ پھیلے گی ایسی کہ بجھ نہ پائے گی

تمام شہر پہ چھائی ہے تیرگی لیکن
مرے مکاں میں آئے تو ڈوب جائے گی

مرا وجود مسلسل عذاب ہے اس پر
مری حیات کب اس سے نجات پائے گی

میں تھک گیا ہوں بہت زندگی بتا دے مجھے
بلندیوں کی طرف کب مجھے اٹھائے گی

میں تری زلف کی چھاؤں میں منہ چھپاؤں گا
جلو میں چاند لئے رات جونہی آئے گی

نسیم باغ میں سنتے تھے جو منڈھیروں پر
وہ گیت موت سے پہلے مجھے سنائے گی

تمہارے ماتھے سے پھوٹے گی جب کرن کوئی
اندھیری رات میں رستے کئی بنائے گی

وہ اپنے آپ کو پہچان لے تو اس کے بعد
میں جانتا ہوں مجھے آئینہ دکھائے گی

دیارِ مرگ میں بے خوف جب میں اتروں گا
تو زندگی بھی مرا حوصلہ بڑھائے گی

☆☆

سائباں دھوپ کا ہو، یاد کا ہو، جو بھی ہو
سنگ برسیں گے تو ہم سر کو بچائیں کیسے

آگ بستی میں لگا دی پہ یہ سوچا ہی نہیں
آگ تو آگ ہے اب گھر کو بچائیں کیسے

آخری رات ہے اس سال کی ہمزاد مرے
آخری خواب کے منظر کو سجائیں کیسے

رازداں ہو کوئی موسم کا تو اتنا کہہ دے
آگ برسے تو گلِ تر بچائیں کیسے

☆☆

دھول ارمانوں کی صحراؤں میں اڑتی ہوگی
پھول احساس کی انگنائی میں کھِلتا ہوگا

راستے ڈھونڈتے ہونگے ترے رہرو کا سراغ
قافلہ شہر کی گلیوں سے گذرتا ہوگا

سخت حالات کی پتھریلی گذرگاہوں پر
اگلے وقتوں کا کوئی دوست تو ملتا ہوگا

مرے کشمیر کا نیرنگ زمستان توبہ
کانچ کے فرش پہ پاؤں بھی پھسلتا ہوگا

☆☆

صحرا صحرا کالی رات
میں ہوں اور تنہا سی رات

گلشن گلشن سناٹا
گم صم ڈالی ڈالی رات

سپنوں کی دہلیز پہ آ
آتی ہے متوالی رات

کوئی دیپ نہ تارا ہے
خالی آنکھیں خالی رات

تنہا تنہا میں فاروقؔ
کیسے کاٹوں کالی رات

☆☆

زندگی کو چھوڑ کر جائیں گے ہم
مرکہاں جائیں گے ، گھر جائیں گے ہم

طے کریں گے ایک مشکل مرحلہ
جان سے جس دن گذر جائیں گے ہم

کتنے صحرا لانگ کر آئے ہیں ہم
مُڑ کے دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے ہم

ظلمتوں کی وادیوں میں ایک دن
روشنی بن کر اتر جائیں گے ہم

گھیر لیں گے آسماں کی وسعتیں
بن کے خوشبو جب بکھر جائیں گے ہم

☆☆

دولت درد کو بچا رکھنا
غم کو غیروں میں بانٹ مت دینا

صبح آثار رات لگتی ہے
دوستو، پھر بھی جاگتے رہنا

جس میں تسکین کی ہوا نہ چلے
ایسے گھر کو جلا کے رکھ دینا

خون سے کربلا کے دامن پر
نوکِ مژگاں کے نام حق لکھنا

ظلم کی رات کٹ ہی جائے گی
شام کے طاق پر دیا رکھنا

ذہن پر زور ڈال کر فاروقؔ
زیب دیتا نہیں غزل کہنا

☆☆

اتنا ارزاں تو نہ تھا خانہ خرابوں کا لہو
خون بہا ان کو ملا اپنے ہی خوابوں کا لہو

بس اسی بات پہ نالاں ہیں فقیہان شہر
میرے شعروں سے ٹپکتا ہے کتابوں کا لہو

دیکھنے والوں کو تصویر نظر آئے گی
میرے دامن پہ فروزاں ہے گلابوں کا لہو

وقت سے پہلے بوڑھا ہوگیا
یہ جوانی میں بہت سوچا کیا

اس کی آنکھیں ہیں کہ ویرانے کی شام
دیکھتے ہی دیکھتے اندھا ہوا

پہلے آنکھوں کی بصارت سے گیا
بعد میں یہ رات کا قابل ہوا

اور بھی کچھ لوگ میرے ساتھ تھے
میں اکیلا ہی مگر آیا گیا

ڈھونڈتے کیا ہو اندھیری رات میں
کچھ ہی نہیں جی ! میرا سایا کھو گیا

رات میرے ساتھ تھا میرا خدا
آدمی کو دیکھ کر تھرا گیا

☆☆

پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے ورنہ
ہم بھی اس شوخ کی تشہیر کا دم رکھتے ہیں

جس پہ قربان ہو مسرت کا طلسم رنگیں
ہم اسی غم کا بڑی دیر سے غم رکھتے ہیں

کہہ دو خوشیوں سے کہ اس دل کو نہیں ہے فرصت
ہم تو ہر لحظہ سے وقفِ الم رکھتے ہیں

رات کی رات نہ جاؤ تو کوئی بات بنے
ہجر کے سائے مجھے وقف الم رکھتے ہیں

ان کے چلنے سے بہاروں کا مہکتا ہے دماغ
پھول کھلتے ہیں جہاں پر وہ قدم رکھتے ہیں

ہم سے شبنم نے بھی رونے کی ادا پائی ہے
ہم کہ جو شام و سحر آنکھ کو نم رکھتے ہیں

☆☆

میرے بتخانے کا اعجاز تو دیکھ اے زاہد
جب اُجڑتا ہے تو اللہ کا گھر ہوتا ہے

راہ میں مل کے وہ کترا کے گزرنا تیرا
یوں بھی ایک حادثۂ گزر ہوتا ہے

اشک بن بن کے ہر اک یاد ٹپک پڑتی ہے
ہجر میں معجزۂ دیدۂ تر ہوتا ہے

ہم نشیں ایسی کسی محفلِ رنگیں کا سراغ
اک چرچا سا جہاں شام و سحر ہوتا ہے

☆☆

# وریندر پٹواری کے نام

چہروں پہ دھول پاؤں میں چھالے لئے ہوئے
کس بے دلی سے اپنا وطن چھوڑ کر گئے

ویراں ہے بت کدے کی سحر میکدے کی شام
رعنائی بہار چمن چھوڑ کر گئے

ڈیرے لگا کے بیٹھ گئے دھوپ دشت میں
سایہ چنار سرو سمن چھوڑ کر گئے

موسم کے رنگ ڈھنگ بھی شاید انہی سے تھے
بوئے گلاب مشک ختن چھوڑ کر گئے

کھل کر گرے نہ برف کے گالے تو یہ کھلا
وہ خرقہ پوش اپنا کفن چھوڑ کر گئے

وہ آرتی کا سوز کہاں پربتوں کے بیچ
بنسی کی تان واکھ بجھن چھوڑ کر گئے

پروائیوں کے ہاتھ ، وہ خوشبو کی دستکیں
کھڑکی جھالیوں میں پون ، چھوڑ کر گئے

وہی میں ہوں وہی خالی مکاں ہے
مرے کمرے میں پورا آسماں ہے

دیارِ خواب و چشم دل فگاراں
جزیرہ نیند کا کیوں درمیاں ہے

سکوتِ مرگ طاری ہر شجر پر
یہ کیسا موسم تیغ و سناں ہے

چمن افسردہ، گل مرجھا گئے ہیں
خزاں کی زد پہ سارا گلستاں ہے

بھلا دی آپ نے بھی وہ کہانی
محبت جس کے دم سے جاوداں ہے

☆☆

اپنے دل کی بات سنانا
ساری ساری رات سنانا

اُن سے تنہائی میں مل کر
دور ہوئے شبہات سنانا

اُن پر جو گذری سن لینا
اپنے بھی حالات سنانا

گلیاں میں سنسان نگر کی
خالی ہیں فٹ پاٹ سنانا

تیرے دستانے میں آخر
کس کا نکلا ہاتھ سنانا

خاموشی سے خاموشی تک
کتنے ہیں درجات سنانا

خون کی بارش جب برسی تھی
کیسے لگے تھے پات سنانا

کیسے دی فاروق میاں کو
مفتی جی نے مات سنانا

☆☆

# نظمیات

# اور پھر یوں ہوا

اور پھر یوں ہوا
ایک پھیلی ہوئی شاخ کاٹی گئی
پیڑ زخمی ہوا
پردۂ خاک سے پردۂ ساز تک
سرسراتی ہواؤں نے نوحے پڑھے
شاخ تا شاخ رونے کی آئی صدا
اور پھر یوں ہوا
شاخ کچھ روز میں اک عصا بن گئی
جس سے ریوڑ کو ہانکا گیا
پیڑ زخمی ہوا پات گرنے لگے

پیڑ خالی ہوا
سایہ سایہ ہر اک سمت آئی صدا
اور پھر یوں ہوا
میرا اک ہاتھ کٹ کر زمین پر گرا
میرا بچھڑا ہوا ہاتھ جلتی ہوئی ریت پر
پھڑ پھڑانے لگا
انگلیاں ہاتھ کی گنگنانے لگیں
حد سے بڑھتے ہوئے ہاتھ توڑے گئے
حد سے بڑھتی ہوئی شاخ کاٹی گئی

☆☆

# تنہائی

شور کی بستی سے نکلے
اور اک پُرشور دریا کے کنارے پر کھڑے
سوچتے ہیں وقت اب کیسے کٹے
سامنے کالا سمندر یاد کا
دور تک بھورا پہاڑی سلسلہ
سبز سونا سایۂ اشجار میں گھل مل گیا
دھوپ کالی چوٹیوں پر سوگئی
نیلی نیلی تتلیاں خودرو گلوں کو چومتی
بہتے پانی پر اڑیں، کچھ بہہ گئیں، کچھ کہہ گئیں
شام کا سونا نگر آباد کر
جامِ زریں دستِ سیمیں میں اٹھا
ہاتھ کی گہری لکیروں کو بدل
پھول سے رخسار پر آنچل نہ ڈال
ہونٹ پیاسے ہیں انہیں امرت پلا
رات کو گلنار کر نزدیک آ !

☆☆

# ایک آرزو

اس طرح ہو کہ ہر اک پھول پہ بھنورا ناچے
اس طرح ہو کہ نہ ہو بیم خزاں گلشن میں
اس طرح ہو کہ بہاروں کی مہکتی رُت میں
آسماں جاگ اٹھے جیسے ہی پنچھی چہکیں
میگھ ملہار کوئی گائے تو بارش آئے
مہرباں رات، مہتاب ہو مستی بردوش
ماتھے ضو پاش ہوں، بچوں کی کتابوں کی طرح
مسکراتے ہوئے لمحے ہوں گلابوں کی طرح
اس طرح ہو کہ نگاہوں میں مروت جاگے
سامنے کوئی بھی آجائے، کہیں سے آئے
دل ملیں دل سے تو ہر سمت محبت جاگے
بے خودی بانٹ لیں، خوابوں کے جزیروں کی طرح
آنکھیں آنکھوں سے ملیں، دل کے سفیروں کی طرح

☆☆

# اعتراف

مجھ کو سولی پہ چڑھا دو مجھے سنگسار کرو
میرے ہونٹوں کے دریچے کو مقفل کر دو

میری آنکھوں کی بصارت کے دیئے گل کر دو
میرے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ بھر دو

میں نے چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش کی ہے
ڈوبتے چاند کو گرنے سے بچایا تم نے !

☆☆

# یادِ ماضی

وہ دن یاد نہیں، کیا تم کو
جب ہم دونوں رات گئے تک
تہ خانے کے اندھیاروں میں
سِلوٹ سلوٹ ٹاٹ پہ لیٹے
اک دوجے کو کاٹ رہے تھے
اندھیارے کی چادر اوڑھے
چھپ جانے کی بنتی کرتے
اور پھر ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھا کر
دونوں کہتے بار خدایا، پاپ نوار

☆☆

# سبز پرندہ

جان لیوا ہے گھٹن سبز پرندہ چپ ہے
اپنی ہی بات گلوگیر ہوئی جاتی ہے
ہونٹ ٹھہرے ہوئے سوکھے ہوئے پتوں کی طرح
سانس ہلتی ہوئی زنجیر نظر آتی ہے
جرسِ دل کو ذرا کوئی ہلا کر دیکھے
کب تلک قافلۂ عمرِ رواں ٹھہرے گا
کوئی سایہ نہ کوئی پیڑ، بہت گرمی ہے
روکنے والو کہو، کوئی کہاں ٹھہرے گا
آج کی رات ارادوں پہ گراں گزری ہے
آج کی رات ستاروں پہ گراں گزری ہے
لو سرِ دار کوئی شعلہ نفس پہنچا ہے
پھر انا موت کا پیغام ہوئی جاتی ہے
دستِ سقراط میں اب زہر بھرا جام نہ دو
یہ ادا باعثِ الزام ہوئی جاتی ہے

☆☆

# سوغات

رات سنسان ہے خاموش سمندر کی طرح
وقت سویا ہوا لیٹے ہوئے ساحل کی طرح
لمحے ساکت ہیں کہ بکھرے ہوئے کنکر ہر سو
تھم گئی چور ہوئی آج پلوں کی پایل
جانے کس دشت میں ٹھہرے ہیں ہوا کے جھونکے
چاند نکلا ہے سیہ فام لبادہ اوڑھے
کرنیں لرزاں ہیں کہ پگھلا ہوا لوہا برسے
گرد میں گم ہیں پگھلتی ہوئی سونی راہیں
تلوے جلتے ہیں اِدھر پاؤں پھسل جاتے ہیں
سانس جلتی ہے کہ سینے میں چِتا جلتی ہے
کہکشاں دھول میں لپٹی ہوئی اک راہ گزر
بامِ مہتاب کہاں اوج ثریا بھی نہیں
خاک آلودہ ہے اوشا کی حنائی انگلی
مشعلِ غم بھی اندھیروں میں بجھی جاتی ہے
اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اکیلا فاروقؔ
خوابِ نادیدہ کی سوغات لئے پھرتا ہے
اور کیا لاتا یہ تمثیل کی دنیا کا فقیر
حرفِ ناگفتہ کی سوغات لئے پھرتا ہے !

☆☆

# یادِ فراموش

ایک طوفاں اٹھا
ایک آندھی چلی
زندگی کی کلی تھرتھرا کر گری
'یوں گری، جیسے بھولی ہوئی یاد ہو
یوں اُڑی جیسے بولی ہوئی بات ہو
ایک طوفاں اٹھا
ایک آندھی چلی

☆☆

# ایک مکالمہ

جب تجھے وقت ملے
یاد دلانا مجھ کو
وہ شبِ وصل کہ جب نور کے دریا پہ کھڑے
ہم نے دیکھی تھی
تلاطم میں جھکولے کھاتی
پیلے اخبار کے کاغذ کی بنائی ہوئی ناؤ
جب تجھے وقت ملے
یاد دلانا مجھ کو
دھوپ صحرا میں شرابور بدن تھا دن کا
ایک سنسان سڑک ہم کو نگلتی گذری
لوگ چلتے رہے بے نام دِشاوں کی طرف
اور سب اپنے گھروں تک پہنچے
ہم مگر بھول گئے اپنے ہی گھر کا راستہ
جب تجھے وقت ملے
یاد دلانا مجھ کو
تیز خورشید
گھنے بن کا مقدس سایہ
تا بہ نُہ دونوں تھے افلاک کی راہوں پہ رواں

تیری قربت میں بھی احساس تھا تنہائی کا
وقت خاموش تھا ٹھہرا ہوا دریا جیسے
ہم بھی خاموش تھے ٹھہرا ہوا دریا جیسے
جب تجھے وقت ملے
یاد دلانا مجھ کو
پیلے دریا کا کنارہ
وہی پروائی کی چاپ
تم نے دھیرے سے کہا
'درد میٹھا ہو تو خوشیاں بھی تصدیق اُس پر'
پیلے دریا نے سنا

گونگے پیڑوں سے کہا
میگھ نے بات سنی
اور موسم سے کہی
بوئے گل، بن کے تری بات صبا تک پہنچی
میں نے بھی شعلۂ اظہار لپکتا دیکھا
جب تجھے وقت ملے
یاد دلانا مجھ کو
کیا وہی میں ہوں، وہی تم ہو، وہی دریا ہے

☆☆

# آسمان چپ رہا

تشنگی خیمہ زن دشت وصحرا میں تھی
خاک وخون میں نہایا ہوا جسم سینہ سپر
خون آلودہ ہونٹوں پہ حرفِ وفا
قطرہ قطرہ
اذاں میں سناتا ہوا
سوئے مشہد چلا
آسماں چپ رہا
جسم گولان کی چوتیوں پہ کھڑا
رقصِ بسمل میں گم
نیم وا چشمِ حیراں میں خوابوں کا دجلہ سجائے ہوئے
ارضِ موعود کا ورد کرتا رہا
آسماں چپ رہا

☆☆

# ایک نظم

خواب میں کون بُن رہا ہے مجھے
شعر میں کون سُن رہا ہے مجھے
کس نے گاڑا مجھے خلاؤں میں
سنگ میں کون چن رہا ہے مجھے
دھوپ سے جسم ڈھانپ لیتا ہوں
آتشِ غم میں راکھ ہوتا ہوں
رات پھر ظلمتوں کے سائے میں
شمع کی طرح میں پگھلتا ہوں
موسمِ گل سے برف زاراں تک
سینکڑوں رنگ میں بدلتا ہوں
رات کے در پہ اک سوالی ہوں
صبح کی سلطنت کا والی ہوں

☆☆

# وَالّیل اِذا یغشیٰ

وَالّیل اِذا یغشیٰ
ردائے تیرگی شام اوڑھ کر نکلی
سجا کے مانگ میں تاروں کا نور لے کے چلی
چھپائے مہرِ درخشاں کو اپنے سینے میں
اُتر رہی ہے بصد تمکنت خلاؤں سے
ہٹا رہی ہے شعاوں کو اپنی راہوں سے
سمیٹی ہے زمانے کو اپنی بانہوں میں
لُٹا نہ اِس کے تقدس کو خانقاہوں میں
سکوں کی دولت بیدار کا یہی گھر ہے
طلسمِ بودووجودوشہود کا در ہے

☆☆

# تب کیا ہو گا؟

تب کیا ہو گا
تم کیا جانو شدنی کیا ہے
ہونی کیا انہونی کیا ہے
گونجے گی آواز فضا میں
گونجے گی لاہوت کے دل میں
گونجے گی ناسوت کے تِل میں
گونجے گی جبروت سے لے کر
ارض و سما کی ہر منزل میں
چمکے گا آواز کا شعلہ
دشت و جبل میں
بحر بر میں
تارِ نظر میں
ارض قمر میں
جھلمل تاروں کی کرنوں میں

رَم جِھم پانی کی بوندوں میں
چمکے گا آواز کا شعلہ
دھرتی ریزہ ریزہ ہوگی
چاند گرے گا ٹکڑے ٹکڑے
پربت پربت ٹکرائیں گے
تَل پٹ ساری دنیا ہوگی
دھول فضا میں لہرائے گی
سورج شعلے برسائے گا
قبروں کے مُنہ کھل جائیں گے
مُردے زندہ ہو جائیں گے
پھر کوئی بھید نہ بھید رہے گا
اٹھ فرشتوں کے کاندھوں پر
رب کا عرشِ معلیٰ ہوگا
تب کیا ہوگا؟

☆☆

# نوحہ

سچ کی مٹی، جھوٹ کا کندن، اپنا اپنا سرمایہ ہے
پیکر پیکر کا سایہ ہے
دن کے بوڑھے مٹیالے چہرے کا سایہ
رات کا سایہ
صبح سعادت زخمی زخمی
نیند کی گولی کا کنٹینر
سرہانے پر خالی خالی
سگریٹ کے بٹ
بند ہے اندر سے دروازہ

چاند کے کرنوں کو پہنے گی
تاروں کا گجرا باندھے گی
اپنی مانگ میں چٹکی بھر سندور لگائے
جسموں کے جنگل کی ہرنی
کتنے پیڑ گراتی جائے
صحرا صحرا دھول اڑائے
جنگل جنگل آگ لگائے
شہرِ خموشی کے شہزادے
چپ کا کوئی گیت سنادے

لفظوں کو آزاد کرا دے
معنی کی دیوار گرا دے
بستی بستی آگ لگا دے
دریا دریا خون بہا دے
ہو جائے بے داغ اندھیرا
کرنوں کے دھبے دھلوا دے
آنکھیں اپنی نیند سے خالی
جھوٹا سچا خواب دکھا دے
ایک بدن کا تیس برس سے
بارِ گراں کاندھوں پر لا دے
ٹیبل ٹیبل آوازہ ہوں

داخل دفتر مجھ کو کرا دے
توڑ ریا کے جھوٹے بندھن
پاس بلا لے، ساتھ بٹھا دے
بند ہے اندر سے دروازہ
ہرنی پتھر چاٹ رہی ہے
مکڑی جالا کاٹ رہی ہے

☆☆

# نظم

پیلا سورج
نیلی مٹی
کالے سایے
آدھا سینہ۔ زیرِ قبا
سانسوں کی خوشبو کا گہرا
کویل پگڈنڈی پر تنہا
بہکی سڑکیں
مٹیالے دن
موٹر گاڑی، تانگے لاری، لنگڑے لولے
بہری سڑکیں
اندھے ٹوٹے پھوٹے دوپائے
کمسن بچے، لنچ کے ڈبے
شور شرابا، میلے ٹھیلے
شوں شوں، گوں گوں

کھٹ کھٹ، ٹھک ٹھک
آوازوں کا پاگل ساگر
پکی کالی، راہگذر پر خون کے دھارے
پھوٹ بہے اور سوکھ گئے ہیں
کویل پکڈنڈی پر تنہا
کوک رہی ہے
پیلا سورج ڈوب گیا ہے
بھوری مٹی لال ہوئی ہے

☆☆

# لوری

عہدِ طفلی کہ مرے گھر کے کھلے آنگن میں
عید آتی تھی مسرت کے کئی خواب لئے
قہقہے، شوخیاں، معصوم شرارت کے ہجوم
رنگ اور نور کا ٹھہرا ہوا سیلاب لئے
صبح اٹھتے ہی بزرگوں سے دعا ملتی تھی
اور آداب پہ انعام بھی مل جاتا تھا
پھلجڑی چھوٹتی، نظروں کے چمن کھل اٹھتے
دل کہ معصوم تھا ان سے بھی بہل جاتا تھا
اب بھی گھر ہے وہی مہکا ہوا آنگن ہے وہی
اس بھرے گھر میں مگر کوئی نہیں، کوئی نہیں
آشنا چہرے شب و روز ہی ملتے ہیں مگر
ان میں کوئی بھی نہیں جو کہ ہو فرخندہ جبیں
کاش اس رسم کی پالی ہوئی دنیا میں کبھی
کوئی رسما! ہی مجھے اپنا بنا کر دیکھے
صرف اک حرفِ مروت کی جواں آہٹ سے
میرا سویا ہوا احساس جگا کر دیکھے

☆☆

# نِروان

ہاں اسی پیڑ تلے شام ڈھلے آئی تھی
اس سے پہلے بھی کئی بار وہ رنگین ساعت
گنگناتی ہوئی ہر شام یہاں سے گزری
کتنے یگ بیت گئے اور نہ اُسے یاد آیا
ایک شہزادہ اُسی پیڑ تلے بیٹھا ہے
اور سناٹے میں اُس پیڑ پہ تنہا پنچھی
مدھ بھرے سُر میں کوئی بول سنا جاتا ہے

☆☆

# گمشدگی

نہ وادیوں سے کہسار سے پتہ پوچھو
نہ مجھ کو جھیل کی گہرائیوں میں تم ڈھونڈو
میرا سراغ نہ پاؤ گے خانقاہوں میں
جو شہر آؤ تو کمپیوٹروں سے مل لینا
انہی سے اپنی خبر اور مرا پتہ لینا

☆☆

# کلمۂ شکر بنام لبِ شیریں دہنان

(فیض کے انتقال پُر ملال پر)
عظمتِ صحبتِ خوباں کی روایت بانٹیں
شہر میں فیض نہیں کس سے رقابت بانٹیں
سلطنتِ شہر نگاراں کی ہوئی ہے تاراج
کون اب ہجر کی راتوں کو گرانی بخشے!
کس سے اب وصل کے لمحوں کی شرافت بانٹیں
غیر اب ناوکِ دشنام چلائیں کس پر
یار اب کس سے نئی طرزِ ملامت بانٹیں
محتسب گریہ کُناں، پیرِ مغاں ہے برہم
کس کی محفل میں مئے شانِ طریقت بانٹیں
ہم سے اب اہلِ کرم، اہلِ نظر بن کے ملیں
ہم بھی کیا بات کریں سرِ ولایت بانٹیں
اب مسرت کے خزانوں پہ کڑے ہیں پہرے
خوش رہیں خاک نشیں ہم سے مصیبت بانٹیں
"کلمۂ شکر بنام لبِ شیریں دہناں"
صحبتِ ہجر کریں گنجِ رفاقت بانٹیں
فیض کے عشق کی فاروق پہ تہمت ٹھہری
دوستو، چارہ گر، آؤ یہ عزت بانٹیں

☆☆

# نگیٹیو

چھپ گیا کالی گپھا میں چھپ گیا
نقطۂ موہوم تھا اک دیدہ، اب
خواب کا سایہ بنا
نیند کا جادو جگاؤ
روشنی کو ڈھیر کر دو
تیرگی کا راج ہوگا
کل کے دل میں آج ہوگا
پیکرِ شب کے بدن میں
موجِ خوشبوئے فروزاں
زلف شبو کی گرہ سے
عنبرِ لرزاں، ہویدا
چھپ گیا کالی گپھا میں
دشمنِ اسرارِ پنہاں

☆☆

# نظم

رات کی آہنی خموشی میں
تم نے دیکھا ہے نور کو محبوس
بات کو قید، لفظ کو پابند
لب مقفل، نگاہ آہن پوش
کان آواز کو ترستے ہوں
پیڑ بے سدھ، پہاڑ سنجیدہ
بت اکیلا ہو بند کمرے میں
تیسری آنکھ گنگناتی ہو
آگ یخ بستہ، آب جلتا ہو
خواب گویا، حقیقتیں خاموش
نور تاریک، تیرگی روشن
احمریں خاک، پھول بے چہرہ
سرو بے قد، چنار بالشتہ
ریت لرزاں مگر ہوا جامد
ایسی دنیا خیال خام نہیں
ایسی دنیا کا کوئی نام نہیں

☆☆

## دمِ رخصت

گھر سے نکلا تو درِ بام سے آئی آواز
اپنا کل چھوڑ کے کس حال میں رہنا ہے تجھے
راستہ دور تلک مجھ کو صدا دیتا تھا
تیرا فردا ہوں مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
آئینہ توڑ کے کمرے میں چلا آیا ہوں
چھوڑ کے خود کو ہر اک چیز اٹھا لایا ہوں

☆☆

# جنگ جاری ہے

یہ دردِ مستقل
جہدِ مسلسل ہے
اسے پیمانۂ امروز فردا سے اگر ماپا
تو خوابوں کے دریچے بند ہونگے اور
تعبیروں کے آئینے بھی گِر گِر کر ٹوٹ جائیں گے
ہمارے پتلیوں سے عکس گِر گِر کر پھوٹ جائیں گے
یہ دردِ مستقل
جہدِ مسلسل ہے
غبارِ صبح میں لپٹا ہوا سورج
نہ فرخندہ نہ تابندہ
شعائیں مضمحل ہیں۔
اونگھتے چھتنار پر جیسے ہوا بے سدھ تحرک کو ترستی ہے
مسلسل نیم تاریکی فضاؤں سے برستی ہے
اُمس ہے دل گلستاں میں
مشامِ جاں میں خوشبو کا گزر ہوتا نہیں ہے اب
کسی گل پر لرزتے رنگ تتلی کے پروں پر جا نہیں رکتے

نہ بھونرے ہی کی گنجن ہے
نہ نرگس محوِ گریہ ہے
گل داؤد پر بلبل غزل خواں اب نہیں ہوتی
کوئی عذرا، کوئی لیلیٰ پریشاں اب نہیں ہوتی
یہ درد مستقل
جہدِ مسلسل ہے
یہ بستی کتنی اچھی تھی
جیالے نوجوانوں، گلبدن گل پیکروں کا ایک مسکن تھی
گلوں پر روشنی کے زاویے، پُرکیف لمحوں کو مہک میں قید کرتے تھے
فضا میں نور بھرتے تھے
سنہرے پل، دھنک ایام کی ترتیب دیتے تھے
برف گرتی تو ہر شے ایک سی ہوتی
مگر لگتی بہت اچھی

یہ بستی خوبصورت تھی
ضرورت سے زیادہ خوبصورت تھی
مجھے اچھی طرح سے یاد ہے وہ شام

جب پنچھی بسیروں کی طرف آئے
گڑریا بھی، پہاڑی سے اتر آیا
نگرواسی گھروں کو لوٹ آئے
قمقموں کی روشنی میں پوری بستی جگمگا اٹھی
رِدائے شب کو اوڑھے پوری بستی خواب میں ڈوبی
مجھے اچھی طرح یاد ہے
پچھلے پہر کی خامشی، دہشت کا سناٹا
مجھے اچھی طرح یاد ہے
پچھلے پہر بادل پھٹنے کی صدا آئی
صدا ایسی کہ ہر آواز اس میں کھوگئی ایسے،
کہ جیسے ایک طوطی کی صدا نقار خانے میں
دھما کہ ایسا دہشت ناک تھا
جیسا کہ ہوتا ہے
مجھے اچھی طرح سے یاد ہے
اُس رات کی آغوش سے جو صبح نکلی تھی
وہ زخمی، سر بریدہ، دل گرفتہ، بانجھ بیوہ کی طرح
بے چارگی کا حرفِ ماتم تھی

نہ قمری کی صدائے ہُو،
کوئل کی کوئی کُو کُو
نہ بلبل چہچہائی
اور نہ مسجد سے اذاں آئی
دھما کہ۔ساری آوازوں کو اپنی جیب میں ڈالے
عجب انداز سے بستی کے بازاروں سے گزرا تھا،
یہ درد مستقل
جہدِ مسلسل ہے
ابھی تک۔میرے بازاروں میں، بے رونق دکانوں پر۔
کفن کی ہے فراوانی۔میری بے نام گلیوں میں
لہو کی ہے فراوانی
ابھی تک۔جنگ جاری ہے

ابھی آتنک جاری ہے
صلیب آراستہ رکھنا۔ابھی
مقتل کی جانب آرہا ہوں۔آرہا ہوں میں

☆☆

# دوری

دور سے سبزہ ہرا زیادہ لگتا ہے
چاند بھی دور سے پیارا زیادہ لگتا ہے
تم بھی اونچے
برفانی ٹیلوں کے پیچھے
بسنے والی،
اک بستی کو،
جنت کی تصویر سمجھ کر
برفانی طوفانوں سے ٹکرا کر
اپنا سب کچھ کھو دیتے ہو
ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔
میری دادی بچپن میں، سب بچوں کو سرہانے آ کر
دور دیس کی پیاری پیاری کتھا سناتی
دادا جب پنجاب گئے تھے،
ماموں جب قندہار گئے تھے،
دادا جب پنجاب سے آئے،
سپنے لائے،
اپنا نام گنوا کر آئے،
گلی گلی میں ہاتو ہاتو کہہ کر

لوگ بلاتے اُن کو
تخت ہزارہ،
ہیر کی خوشبو
بانکا رانجھا
سوہنی اور مہیوال کے قصے
سچ تھے لیکن
دور سے زیادہ سچ لگتے تھے
ماموں، جب قندھار سے لوٹے
ٹوٹ گئے تھے
بکھر گئے تھے

کھاکھر خان کا مسکن
اس کی زندہ یادوں کا مدفن تھا،
میری دادی،
کتھا سنا کر
رو پڑتی تھی
پھر کہتی تھی
دور کے ڈھول سہانے بچو
دور کے ڈھول سہانے،

☆☆

# نظم

عشق نہیں مجبوری ہے
درد اگر چاہت نہ بنے تو
چاہت کی کیا قیمت ہے
عشق اگر سودا نہ بنے تو
عشق بڑا بد قسمت ہے
وصل کا لمحہ ایک لمحہ ہے
برسوں، صدیوں کا حاصل
اِس لمحے کو یاد کرو تو
پل میں لمبی رات کٹے
ہجر محبت کا وہ موسم
جس کے روپ ہزاروں ہیں
اس موسم کے صدقے سائیں
یہ موسم تو دائم ہے

☆☆

# میرا جی

کایا نگری کا اک راجہ
اپنے من کے رنگ محل میں
دیپ جلا کر ٹھنڈی ٹھنڈی روشنیوں میں
مدھو ماتی، گج گامنیوں کو
اپنی بانہوں کے ہالے میں
چاند کا جھومر پہناتا ہے
کام نگر کا اک شہزادہ
اپنی اِچھا، کا سودائی
ابھیلاشا کا اتردائی
قد میں پربت، پربت اونچا
ذات میں پھیلا، پھیلا صحرا
مرگ نینی کے پیچھے پیچھے
لیلیٰ لیلیٰ کہتا جائے
حال اتیت میں کھویا کھویا
مستقبل سے آنکھ چرائے
کام نگر کا جٹا دھاری
پون جھکولوں کے کاندھوں پر
جنگل جنگل مینہ برسائے
قطرہ قطرہ خون بہائے

پیاسا آئے پیاسا جائے
دھرتی پوجا کا متوالا
جلتی رت آشاڑھ کی آئے
دھوپ کا وستر دھارن کر کے
ماگھ ششر میں برف کی چادر
تان کے دیپک راگ سنائے
ساون بادوں دو ہی مہینے
اس کی آنکھیں برسوں برسیں
تارے بھی آگاش میں چمکیں
چاند کھلے کھل کر مر جھائے
سورج نکلے پھر چھپ جائے
دھرتی ماں کا راج دلارا
جاگ جاگ کر جیون کاٹے
نیند سے اکثر آنکھ چرائے
ماضی کے جنگل کا جوگی
سبزہ سبزہ جگنو ڈھونڈے
باسی پھولوں کی خوشبو میں
تتلی کے رنگوں کو کھوجے
تھک جانے پر -------
اپنی چھایا اوڑھ کے کچھ وشرام کرے

☆☆

# پہلی رات کا خواب

میں اک سانپ کو اپنی چھاتیوں سے دودھ
پلا رہی تھی۔ اس کے ملائم وجود کے سرسراہٹ نے
میرے بدن میں زبردست ہلچل پیدا کردی، اور
میں نے اسے اٹھا کر دور پھینک دینا چاہا۔ لیکن
یہ سانپ نہایت ہی دلفریب اور من موہک
تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔
اتنی کشش کہ میں اسے گزند پہنچانے کی جرأت
نہ کرسکی۔ وہ سمجھ گیا، مجھے محسوس ہوا
کہ وہ سمجھ گیا، کہ میں نے اسے پسند کیا ہے۔
اس لئے بار بار زبان ہلا ہلا کر جیسے وہ
میرے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرنے لگا
میرے دل میں ایک عجیب طرح کا احساس
جاگ اٹھا۔ اور اسی احساس کے سائے میں
میں گہری نیند میں ڈوب گئی

☆☆

# دوسری رات کا خواب

میرے باغ کی مختلف کیاریوں میں
لگے پھولوں کے پودے ایک ساتھ ہل رہے ہیں۔ان
پودوں پر لگے پھول خون میں لت پت
ہیں۔میں نے سنا پھول ایک ساتھ مجھ سے
کہہ رہے ہیں۔تمہارے سانپ نے ہم کولہولہان
کردیا۔اپنے زہریلے دانتوں سے ہمارے بدن
گھائل کردئے یہ ہم کو بے دردی سے ڈس رہا ہے معاًدہ سانپ
میرے بدن سے لپٹ گیا۔اس نے میری گردن
کے گرد ایک حلقہ بنالیا۔اپنا منہ
میرے کان پر بولا۔ان کی بات
پر گرگز یقین نہ کرنا۔سب جھوٹے ہیں
سچ بات تو یہ ہے کہ ان پھولوں کے ساتھ لگے

کانٹوں نے میرے جسم کو چھلنی کر دیا۔ میرے زخموں
سے رستا ہوا خون ان پھولوں پر لگا ہے۔
یہ خون ان کا نہیں میرا ہے۔
میں دیکھ رہی تھی، اس کا سارا وجود زخمی تھا۔
اس کی جلد سے درد کی ٹیسیں اٹھ اٹھ کر
میرے کانوں کے پردے پر تھاپ دے رہی تھی۔
وہ آہستہ آہستہ میرے سینے پر کنڈلی مار کر
بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل کر
میرے رخساروں پر پھیل گئے۔ تو اس نے
اپنی نوکیلی نرم زبان سے میرے آنسو پونچھ لئے
ہم دونوں گہری نیند سو گئے

☆☆

# تیسری رات کا خواب

میرے آنگن میں سفید برف تاب کبوتروں کا
ایک جھنڈ اُتر آیا۔ کبوتروں کا جھنڈ چیخنے لگا، چلانے لگا
میں نے ان کی آواز پر پوری توجہ سے کان دھرلیا۔
وہ بول رہے تھے اس سانپ نے ہمارے بچوں کا خاتمہ کردیا
ہے۔ اس نے ہمارے انڈے اور اُن میں نیم خام بچوں کو اپنا
لقمہ بنادیا۔ یہ ظالم ہے، خدارا ہمیں اس کے
ظلم سے خلاصی دو سانپ جھٹ میری گردن
سے لپٹ گیا۔ اور میرے کان میں
کہا۔ یہ سب جھوٹے ہیں۔ دراصل
آسمان سے ایک باز اترا تھا جس نے ان کے
بچوں کو مارڈالا۔ ان کے انڈے توڑ گیا
جونہی میں نے باز کو یہ تباہی مچاتے دیکھا
تو میں نے گھات لگا کر اس پر حملہ کردیا
اور اسے ڈس لیا۔ جھک کر دیکھو۔ اُس
سفاک باز کی لاش تمہارے قدموں پر ہے۔
یہ کہہ کر سانپ ایک فاتحانہ انداز
اور جارحانہ ادا کے ساتھ میرے وجود سے لپٹ گیا
یہ منظر دیکھ کر بھولے بھالے کبوتروں کے

ہوش اڑ گئے، اور وہ ہراساں ہراساں
آسمان کی وسعتوں میں اڑ گئے
سانپ نے میرے جسم کو پوری طرح سے
اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور اسی اثناء میں
مجھے لگا۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں
غرض ان گنت سورجوں کی گرمی میرے
انگ انگ میں پھیل رہی ہے، میرا جسم انگارے
کی طرح دہک رہا ہے۔ سانپ نے
میرے ہونٹوں کے ساتھ اپنے ہونٹ پیوست
کر لئے، میرے منہ سے چیخ نکلی۔
سانپ نے اپنا سارا زہر میرے بدن

میں اتار لیا تھا یہ تو نے کیا کیا؟ ظالم۔ میں نے تو
تم سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ اے
نرموہی، میری گلاب ایسی کایا کو
وِش پلا کر نیلا کرنے سے تجھے کیا ملا
میری بات سن کر۔ سانپ کی آنکھوں
سے آنسو بہنے لگے۔ اس کی پھنکار
ایک بے بس بیمار کی سسکی میں

بدل گئی، میرے ہونٹوں پر
ڈنگ لگا کر وہ بول اٹھا
میں صرف اور صرف تمہارے لئے جی رہا تھا
تیرے بغیر مجھے مرنا گوارا نہیں تھا۔ میرا
آخری وقت آ گیا۔ تو سوچا کہ تجھے بھی
موت کے اندھیروں میں اپنے ساتھ لے جاؤں۔
یہ کہتے ہی سانپ نے پھول کی شکل
اختیار کر لی۔ اور میں دفعتاً
ایک کبوتر کے آکار میں ڈھل گئی۔
اب میں نے اپنی چونچ سے اس پھول کو
یعنی سانپ کو اٹھانا چاہا۔ مگر جونہی میں
آگے بڑھی۔ وہ پھول ایک باز بن گیا۔
اور مجھے اپنے پنجوں میں اٹھا کر
آکاش کی بلندیوں میں اڑنے لگا۔
دور بہت دور ہم سورج کے
نزدیک پہنچ گئے۔ اور دونوں
جل کر راکھ ہو گئے۔۔۔۔۔۔
اور پھر میری آنکھ کھل گئی

☆☆

# ذکرِ مہجور

ذات بترات ہے کیا ایک ہیں کشمیر کے لوگ
دل ہیں جب ایک تو دوری کا فسانہ کیا ہے
سوسنہ جوہی سے پوچھے گی میرے جانے کے بعد
وہ میرا غم خوار تھا مہجور جانے کیا ہوا
جب نہ آئے گا انہیں فاروقؔ پھولوں میں نظر
سوسنا جوہی سے پوچھے گی کہاں ہے ہمسفر
پھول مرجھائیں تو مرجھائیں بہار آئے گی
زندگی موت کے سائے میں جلا پائے گی
پھول جھڑتے ہیں مگر پھر بھی بہار آتی ہے
زندگی موت کے سائے میں جلا پاتی ہے

☆☆

# ایک خیال

وقت کے پانی پہ رواں
ایک بے نام بدن ---
موج در موج وہ پیکر کے خطوط
عکس در عکس -----
شکستہ ہوئے خوابوں کے نقوش

☆☆

# دوسرا خیال

گہرے پانی میں بدن پورا ڈبو کر نکلا۔
پہلے اس شان سے اترا کہ۔ ابھر آئے گا۔
بعد میں ایسے وہ سمٹا کہ لہو کا قطرہ۔
آب نیساں کی طرح سنگ پہ بکھرا۔ پھیلا۔

☆☆

# تیسرا خیال

نظر آ ہی جائے گا اپنا کوئی۔
الجھ جائے ہم سے پرایا کوئی۔
ہے سر پر تنا سایباں دھوپ کا۔
یہاں پیڑ ہے اور نہ سایہ کوئی۔

☆☆

# محبت کا دیوتا

کاش مجھے معلوم ہوتا
کہ اس غارت گر ہوش کو بھی خبر تھی،
کہ وہ کس کے دل کو اجاڑ کر گیا
اے کاش میرے دل کو خبر ہوتی۔
کہ وہ مجھے لوٹ کر کن دشوار گزار راہوں پر نکل گیا ہوگا۔
سوچتا ہوں، کہ کیا وہ ابھی جی رہا ہوگا۔
یا کب کا بے نام پہاڑی راستوں میں بھٹکتے بھٹکتے
موت کی وادی میں اتر گیا ہوگا۔
محبت کے دیوتا۔
محبت ہی کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔
اور آخرش عالم تحیر میں کھو جاتے ہیں۔

☆☆

# سیاہ سپید

نصیب نے ساتھ دیا، اور وہ قدرتی موت مر گیا
سوگام کی سرمئی فضاؤں پر
جب میر کے نغموں کی
پھوار برسنے لگی
تو پالکی میں بیٹھی دلہن نے
گونگھٹ کی اوٹ سے
سفید گھوڑے پر بیٹھے نوشاہ کو ایک
بھرپور نظر ڈال کر دیکھ لیا۔
نوشاہ کا وجود ایک چمکدار نوکیلے خنجر کی طرح
اس کے انگ انگ میں اترنے لگا
وہ کب پالکی سے اتر گئی
کب اس نے کہاروں کو تتر بتر کر دیا
کب وہ نوشاہ کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ گئی
اسے کچھ خبر نہ ہوئی
نصیب نے ساتھ دیا۔ اور نوشاہ قدرتی موت مر گیا۔

☆☆

# 9+2=11

چمن افسردہ پھولوں کی قبائیں چاک داماں ہیں
ہوا بیزار موسم سے، فضائیں شعلہ ساماں ہیں
ستمبر کی روپہلی دھوپ، آتش بار لگتی ہے
سلونی شام کے سائے سے جاں بے زار لگتی ہے
تلاطم خیز ہے لہجہ ہوا کا بات کیا کیجئے
غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے حالات کیا کیجئے

☆☆

# میرا طوطا

پنجرے میں اک طوطا تھا
وہ راتوں کو سوتا تھا
صبح سویرے اٹھتا تھا
جاگو بھور بھئی چودیس
جاگو بھور بھئی چودیس
کل جب میری آنکھ کھلی
دیکھا طوطا پنجرے میں
اک کونے میں بے سدھ تھا
میں نے سوچا بیچارہ
پنجرے میں دم توڑ گیا
مایوسی کے عالم میں،
طوطے کی ہمدردی میں
پنجرے کے دروازے کو
میں نے جھٹ سے کھول دیا
طوطا اڑ کر بھاگ گیا
اب میں سچ مچ جاگ گیا

☆☆

# غلام رسول نازکی کے لئے ایک نظم

سبزی علی سکوتی ۹۰ برس کا ہوا
اس نے اپنے ساتویں بیٹے کو اپنے پاس بلایا
شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا
(اولاد صالح سوال نہیں کرتی، حکم کا انتظار کرتی ہے)
سبزعلی سکوتی زیرِلب مسکرایا
اور پھر بول اٹھا
وتستا کی خاموشی پر مت جا
یہ خاموشی ایک بھیانک طوفان کا پیش خیمہ ہے
یہاں سے نقلِ مکانی کا حکم ہوا ہے۔
کوہِ ماراں پر میرے لئے ایک جھونپڑی ڈال دے
میں وہاں سے بستی کے ڈوبنے کا منظر دیکھوں گا
جب ساری وادی پانی میں غرق ہو جائے گا
تب میں مراقبے میں جاوں گا۔
اور پھر ویری ناگ سے وتستا دلہن بن کر
ولر کے راجکمار کے ساتھ جائے گی۔

وتستا کے کنارے پر واقع اس کی عمارت
''قیدِ حیات'' ۔۔۔۔۔۔ جو پگوڑا فنِ تعمیر کی
ایک دلآویز یادگار تھی
منہ مانگے داموں پر بیچ ڈالی
ہاری پربت سے سٹا ہوا ایک وسیع قطعۂ زمین
خرید لیا
جس کی ایک حد سلطان العارفین شیخ حمزہ کی
درگاہ سے لگی ہوئی تھی۔
اسی قطعۂ زمین پر ایک جھونپڑی بنادی
جس میں سبز علی سکوتی فروکش ہوئے
وتستا آہستہ خرامی سے بہتی رہی۔
سوسنہ، جوہی، مشک بید، گلاب، یاسمن، اشرفی۔
بادام کے شگوفے کھلتے گئے۔
پروائی خوشبو خوشبو بکھرتی رہی
ہوائیں پھولوں کے پیرہن کی طرح لہکتی رہیں
سیلاب کے آثار کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے
وقت آدھی رات کا
اس سے کچھ کم

یا
اس سے کچھ زیادہ
ساتواں بیٹا۔۔۔جھونپڑی کے دروازے پر تیار بیٹھا تھا
سبز علی سکوتی تہجد کے لئے جھونپڑی سے باہر آئے
اور جنگل کی اور چل دئے
بیٹا بھی باپ کے پیچھے پیچھے ہولیا
جنگل کی طرف جاتے جاتے، بیٹے کے من میں سوال آیا
کہیں میرا باپ اورنگ زیب کی طرح اضداد کا مجموعہ تو نہیں
''قید حیات''میں اس کے غسل خانوں میں دودھیا سنگِ مرمر
کے فرش پر نظریں پھسل جاتی تھیں
اوراب
دو چٹانوں کے درمیان گھاس پھوس سے ڈھکا بیت الخلاء
یہ لوٹا، یہ چوپائی
چٹائی کا مصلیٰ
(بیٹے کو خیال آیا۔۔۔بُرے خیال ابلیس کے حملے کی دلیل ہوتے ہیں)
باپ کی تابعداری عبادت ہے
اسے یاد آیا۔ کہ چند لمحوں کے بعد وہ
درودِ حضورﷺ کے بعد پڑھے گا

☆☆

# رب جعلنی القیم الصلوات

کئی بار استغفار پڑھنے کے بعد بھی
ایک اور خیال بجلی کے کوندے کی طرح
اس کے ذہن کے آسمان کو چیر کر نکل گیا
خیال تھا
"کہیں میں نے لاکھوں کا کاروبار چھوڑ کر
عقل، فہم وفراست اور دنیا داری
کو جذبات کی چوکھٹ پر قربان
کر کے غلطی تو نہیں کی۔۔۔دنیا والوں کی
واہ واہ چھوڑ دی۔۔۔دوسروں کی مدد کرنے
کے بعد جو نشے کی حالت طاری ہوتی تھی، اسے
ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا
اپنے قلندر باپ کی خوشنودی کے لئے
اپنی اولاد کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے
پردیس بھیج دیا

انہوں نے وجہ دریافت کی۔۔۔۔تو میں نے
ای میل پر یہ عبارت لکھ بھیجی
اگر تعلیم پانے کیلیئے چین بھی جانا پڑے، دریغ نہ کرو''
اس خیال کے جنگل سے آزاد ہوتے ہی
ایک اور خیال نے اسے آگھیر لیا
وہ سوچنے لگا۔۔۔۔کہ کئی ہفتوں سے
وہ اپنے باپ کا خرقہ اور اپنا جوڑا
اپنے ہاتھوں سے دھوتا ہے۔۔۔وہ اس بیقراری سے
دل برداشتہ ہونے ہی والا تھا۔ کہ آواز آئی
''بیٹے۔ مٹی کی ایک ڈھلی لا دے''
بیٹے کے باطل خیالوں کی ڈور ایک ہی جھٹکے میں
ایسے کٹ گئی۔ جیسے کوئی دلچسپ ٹی وی پروگرام
کرنٹ فیل ہونے سے دیکھنے والے
کو خواب سے نکال کر حقیقت کی پتھریلی زمین پر پٹک دیتا ہے
بیٹے کے منہ سے بے اختیار نکلا
''لایا بابا۔۔۔۔لایا بابا''
بیٹے نے ایک نوکدار پتھر اٹھایا تا کہ ڈھلان سے مٹی

کی ایک دو ڈھلیاں توڑ سکے۔۔۔اس نے کئی جگہ سے
زمین کھرچنے کی کوشش کی۔مگر ساری زمین سنگلاخ
ہو چکی تھی
اس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا
پربت کا رنگ سنہری ہو رہا تھا۔پورے چاند کی
رات میں سارا پہاڑ جگ مگ کر رہا تھا۔
پیڑ، پتھر، جھاڑیاں ہر چیز سونے کی ہو گئی تھی
پھول پتی کو ہاتھ لگایا۔تو یہ دیکھ کر
کہ ہر شے سونے کی ہو گئی
بیٹے کے ہوش اُڑ گئے
اتنے میں باپ نے دوبارہ
آواز دی۔۔۔نماز کا وقت قریب آ رہا ہے
''مٹی کی ڈھلیاں لا دے بیٹا۔۔۔''
بیٹا سٹپٹاہٹ کے عالم میں چلایا
یہاں مٹی کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے
سبز علی سکوتی نے پوچھا
مٹی نہیں ہے، تو پھر کیا ہے

بیٹا بولا۔۔۔ ساری پہاڑی، اس کے بیل بوٹے
مٹی پتھر سب سونے کے ہو چکے ہیں
آواز آئی۔۔۔ ''تو سونے کی ہی ایک ڈھلی لا دے''
بیٹا بولا۔۔۔ سونا۔۔۔ تھوڑے ہی۔۔۔ کے کام آتا ہے
آپ تو جانتے ہیں۔۔۔
سبز علی سکوتی اطمینان سے بولا۔۔۔ ''اگر اس کام کے
لائق نہیں۔۔۔ تو اس کے کھونے کا افسوس کیا معنی''
بیٹے کو دوبارہ بجلی کی کرنٹ سی چھو گئی۔۔۔ وہ ایک
جھرجھری سی لے کر حرکت میں آ گیا، اور زمین
پر جھک گیا
کیا دیکھتا ہے۔۔۔ کہ ساری زمین مٹی میں بدل گئی ہے۔

سبز علی سکوتی نے تہجد کی نماز ادا کی
اس کا بیٹا جھونپڑی کے دروازے پر اونگھنے لگا
مگر چند لمحے بیشتر مٹی کو سونے میں بدلتے اور پھر
سونے کو مٹی میں تبدیل ہوتے دیکھنے کا واقعہ
اس کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ گیا تھا۔

اس کے سینے سے بندشیں ٹوٹ رہی تھیں
دل کی دھڑکنیں ایک خاص آہنگ اپنا رہی تھیں
ہر دھڑکن میں۔۔۔۔اللہ ہو
زیروبم میں۔۔۔۔نام م ح۔۔۔م دؐ

رات کے سناٹے میں سبز علی سکوتی ٹھہر ٹھہر کر
کچھ گنگنا رہا تھا
یہ گنگناہٹ، یہ گنجار۔۔۔جیسے ہر شے کو چھوکر
گذر رہی تھی
سر بلند سفیدوں کی قطاریں جھوم رہی تھی
پُروقار چنار کے پتے تالیاں بجا رہے تھے
دور۔۔۔بادام کے پیڑوں کے جھنڈ میں
شدتِ طلب کی ماری ایک فاختہ
اپنے جھنڈ سے الگ ہو کر، نہایت ملائم اور
دل میں اترنے والی آواز میں گا رہی تھی
حق سرہ ہو، حق سرہ ہو
بیٹے کے کان سماعت سے بےزار ہو رہے تھے

وہ اب آنکھوں سے سننے لگا تھا
یہ لمحہ کتنا مختصر، کتنا طویل تھا
وہ اب کانوں سے دیکھنے لگا تھا
اس کی رگوں میں عجیب طرح کا نور اترنے لگا تھا
اس کے روئیں روئیں میں جگنو چمک رہے تھے
اس کے جوڑ جونہی ملتے تو بدن سے چقماق کی چنگاریاں
نکلنے لگتیں
اس کے گوشت پوشت سے نور کے دھارے پھوٹ رہے تھے
اچانک جھونپڑی کے اندر سے ہزاروں
سازوں کی آواز ایک شعلے کی طرح لپکنے لگی
بیٹا سُن رہا تھا۔۔۔۔سبز علی سکوتی کے لبوں پر
دعا تھی۔۔۔۔شرح لی صدری
پھٹی آنکھوں سے بیٹے نے قریب کی مسجد
سے آنے والی اذان کی آواز سن لی
اصلوات خیر من النوم
اس کی نیند کب کی خواب ہو چکی تھی۔۔۔اور وہ
اب جاگتے میں خواب دیکھنے کا خوگر ہو گیا تھا

آسمان پر صبح صادق کے آثار نمایاں تھے
بیٹے کو لگا جیسے کوہ ماراں (ہاری پربت) کا پہاڑ
بیٹھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے
اس کے کوہان چکریشوری مندر کا بھاری بھرکم
گول پتھر ہیں
جس پر ہزار ہا سال پہلے کسی ودوان نے شری ینتر کا نقش کھود کے رکھا تھا۔
اونٹ کی بائیں پسلی پر شیخ حمزہ مخدومؒ
کی درگاہ ہے، جس کے دروازے پر لکھا ہے
''ہر سحر خورشید می ساید جبیں
بر درِ محبوب رب العالمین''
اونٹ کی بائیں پسلی پر گردوارہ چھٹی پادشاہی ہے
اونٹ کے قدموں میں جلال الدین محمد اکبر کا
کاٹھی دروازہ ہے۔۔۔۔کاٹھی دروازہ
دیکھ کر اسے سیکری فتح پور کا بلند دروازہ
یاد آیا۔۔۔جو اُس نے ہنی مون کے دنوں بڑے چاو سے
اپنی بیوی کو دیکھایا تھا۔
اُسے پرانی عمارتوں اور پرانے ساز وسامان سے

وہ اب آنکھوں سے سننے لگا تھا
یہ لمحہ کتنا مختصر، کتنا طویل تھا
وہ اب کانوں سے دیکھنے لگا تھا
اس کی رگوں میں عجیب طرح کا نور اترنے لگا تھا
اس کے روئیں روئیں میں جگنو چمک رہے تھے
اس کے جوڑ جونہی ہلتے تو بدن سے چقماق کی چنگاریاں
نکلنے لگتیں
اس کے گوشت پوشت سے نور کے دھارے پھوٹ رہے تھے
اچانک جھونپڑی کے اندر سے ہزاروں
سازوں کی آواز ایک شعلے کی طرح لپکنے لگی
بیٹا سُن رہا تھا۔۔۔۔سبز علی سکوتی کے لبوں پر
دعا تھی۔۔۔۔شرح لی صدری
چھٹی آنکھوں سے بیٹے نے قریب کی مسجد
سے آنے والی اذان کی آواز سن لی
اصلوات خیر من النوم
اس کی نیند کب کی خواب ہو چکی تھی۔۔۔اور وہ
اب جاگتے میں خواب دیکھنے کا خوگر ہو گیا تھا

آسمان پر صبح صادق کے آثار نمایاں تھے
بیٹے کو لگا جیسے کوہ ماراں (ہاری پربت) کا پہاڑ
بیٹھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے
اس کے کوہان چکریشوری مندر کا بھاری بھرکم
گول پتھر ہیں
جس پر ہزار ہا سال پہلے کسی ودوان نے شری ینتر کا نقش کھود کے رکھا تھا۔
اونٹ کی بائیں پسلی پر شیخ حمزہ مخدومؒ
کی درگاہ ہے، جس کے دروازے پر لکھا ہے
''ہر سحر خورشید می ساید جبیں
بردرِ محبوب رب العالمین''
اونٹ کی بائیں پسلی پر گردوارہ چھٹی پادشاہی ہے
اونٹ کے قدموں میں جلال الدین محمد اکبر کا
کاٹھی دروازہ ہے۔۔۔ کاٹھی دروازہ
دیکھ کر اسے سیکری فتح پور کا بلند دروازہ
یاد آیا۔۔۔ جو اُس نے ہنی مون کے دنوں بڑے چاو سے
اپنی بیوی کو دیکھایا تھا۔
اُسے پرانی عمارتوں اور پرانے ساز و سامان سے

بے حد لگاؤ تھا۔۔۔ وہ شوق سے کباڑی کی دکان سے
کپڑے بھی خریدتا تھا۔ جب کوئی پوچھتا یہ پرانے کپڑے
پہننے کی تک کیا ہے۔۔۔ تو وہ پوری معصومیت
اور شرارت کے ملے جلے لہجے میں کہتا۔۔۔ یہ کپڑے
بڑے جہاں دیدہ ہوتے ہیں۔۔۔ سرد وگرم زمانہ سے واقف
شاعر نے کہا ہے

وہ بندھن ہی کیا بندھن ہے، نیا بندھن ہوئے
پیر فقیر کی اترن پہنے، چیلا پاون ہووے

بیٹا جھونپڑی پر دستک دینے والی صبح کی پہلی کرنوں
کا منتظر تھا
گردوارے سے صدا آئی

پاتھر پوجے ہری ملے تو پوجوں میں پہاڑ
وا سے تو چکی بھلی پیس کھاوے سنسار

الف اللہ نور اپایا قدرت دے سب بندے
ایک نور تے سب جگ اپجایا کون بھلے کون مندے

کوہ ماراں کے دامن سے صدائے ربانی بلند ہوئی
معرفت کی ہوائیں رقص کرنے لگیں، ذرہ ذرہ

فضاؤں کو مہکانے لگا
کل عالم تیری یاد کرے، تو صاحب سب کا سچا ہے
خوابیدہ مورتیوں کو کسی شردھالو نے دودھ سے نہلایا
مورتی تو نہیں بولی۔۔۔ شردھالو کے اندران گنت
شنکھ بج اٹھے۔ اور ہر طرف سے آواز آئی
شیو شنکر، ہر ہر، شیو شنکر، دکھیارن کو مکتی دیجو
اے پاپ نوارک، اوم ہری، بھگتن پر اپنی دیا کیجیو
سورج اپنی کرنیں ہر سو بکھیرتا گیا۔۔۔ لوگوں کی تعداد
بڑھتی گئی۔ صوفی سنت، گیانی، عقید تمند، نوجوان
بوڑھے، بچے، زن و مرد، کیا خاص کیا عام۔۔۔ سبھی کوہ ماراں
کے گرد چکر کاٹنے میں محو ہو گئے
صبح کی نوخیز کرنیں ابھی تک سبز علی سکوتی کی
جھونپڑی کے دروازے پر پوری طرح نہیں پڑی تھیں
آمد آمد تھی۔۔۔۔۔ مہر تاباں کی۔
مرمریں، نازنین، پہاڑوں کے ماتھے چمک رہے تھے
ہر طرف سے ایک ہی صدا آ رہی تھی
تو ہی تو۔۔۔۔ تو ہی تو

اسے یاد آیا
جب اس کی ماں حج کے بعد لوٹی تھی
تو اس نے کہا تھا
''میں نے رب کا کوٹھا دیکھا، وہ بار بار
مجھے اپنے پاس بلاتا۔۔۔اور میں بار بار کہتی
لبیک، لبیک۔۔۔''
اسے خیال آیا۔۔۔میری ماں تو پوری طرح اُمی تھیں
اس نے پاسپورٹ پر بھی اپنا انگھوٹا چسپاں کیا تھا
اس نے تو شہاب نامہ نہیں پڑھا تھا
اور نہ ممتاز مفتی کی لبیک
پھر اسے صمد میر کا شعر یاد آیا
پڑھ پڑھ کے ہوا پتھر، لکھ لکھ کے ہوا چور
جس پڑھنے سے صاحب ملا وہ پڑھنا ہے اور
اتنے میں سورج پورے جاہ وجلال کے ساتھ مغرب سے
طلوع ہوا
لوگوں کی بھیڑ سمٹ کر جھونپڑی کے کھلے آنگن میں
جمع ہوئی۔۔۔۔۔۔بیٹا بھیڑ کو دیکھتا رہا

اتنے میں سبز علی سکوتی جھونپڑی سے باہر آیا
اور ایک گول پتھر سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا
لوگ آتے گئے۔۔۔۔تقاضے کرتے گئے، گذارشیں
عرضداشتیں، مشکلوں میں آسانیوں کی دعا۔۔۔۔
جو مانگنے آئے تھے، مانگ رہے تھے
سبز علی سکوتی خاموشی کے ساتھ ساتھ ہلا ہلا کر سب کی
تسلی کر رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی
تلاش کی کیفیت تھی۔۔۔وہ کسے ڈھونڈ رہا تھا
لوگ آتے گئے۔اور مرادیں مانگ کر چلتے بنے
سبز علی سکوتی واپس جھونپڑی کے اندر چلا گیا
اچانک۔۔۔اچانک۔۔۔اچانک
جھونپڑی کے باہر کھلبلی سی مچ گئی
ہو، ہو، ہو کی رٹ لگاتا ہوا
ایک مادرزاد ننگا ملنگ
ان لوگوں کے سامنے ظاہر ہوا
جو لوگ ابھی تک جھونپڑی کے سامنے تھے
یہ لوگ اسے دیکھ کر کچھ گھبرائے، کچھ شرمائے

اور کچھ سٹپٹائے وہاں سے چل دئے
ملنگ جھونپڑی کی طرف بڑھا
سبز علی سکوتی نے جھونپڑی کا
پھوس کی بنائی ہوئی چٹائی کا برائے نام
'دروازہ' بند کیا
بیٹا۔ ملنگ اور دروازے کے درمیان کھڑا ہو گیا
ملنگ ہوہو کرتا ہوا۔ زمین پر لوٹ پوٹ ہوا
اس نے آواز دی سبز علی سکوتی۔۔۔کب آئے گا وہ
ملنگ کی آواز جیسے گلے میں جم گئی
وہ لمبی سانسیں لینے لگا
ہر طرف سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی ہیں
سبز علی سکوتی۔۔۔۔خاموش۔۔۔پوری متانت کے
ساتھ کٹیا کے آنگن سے نکلا
اور ملنگ کے ساتھ اونٹ جیسی پہاڑی کے
ٹیلے پر چڑھ گیا۔۔۔۔۔جو کوہان کی طرح تھی
ملنگ نے آنِ واحد میں پہاڑی سے
چھلانگ لگا دی

کوہِ ماراں سے ایک چیخ ٹکرائی۔۔۔۔اور
پھر کھوگئی
بیٹے نے دیکھا۔۔۔کٹیا کا دروازہ بند تھا
زندگی کی ریل پیل شروع ہوئی تھی۔۔۔سبز علی سکوتی
کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا
ظہر کی اذان ہوئی
نہ باڑھ آئی اور نہ ہی شہر غرق آب ہوا

# علی محمد شہباز کے لئے ایک نظم

بار ہا تم سے کہا
ان سے لڑو نہیں، آنکھ مچولی کھیلا کرو
مگر ہر بار تم میری بات سن کر
ان سنی کرتے
مجھے یاد ہے
تم ہر روز ہسپتال جا کر زخمیوں کی عیادت
کر آتے
ایک دن میں نے پوچھا
اس شہر میں تمہارے کتنے اپنے ہیں
تم نے جواب دیا
ہماری نسل کے لوگ مرض الموت میں
گرفتار پیدا ہوئے ہیں
اس لئے ہم سب ناتی ہیں
میں نے تم سے کہا
ان سے لڑو نہیں، آنکھ مچولی کھیلا کرو
مگر تم نے ہر بار میری بات سن کر ان سنی کر دی۔

بھول جاؤ کہ کوئی انہونی ہوئی تھی
خون کے دریا میں طغیانی آج بھی
شباب پر ہے
لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تمہاری
طرف بڑھ رہا تھا
حالانکہ تم نے وہی کیا جو تم کو کرنا چاہئے تھا
اس بات پر رونا فضول ہے۔
کہ تمہارے سینے میں خنجر گھونپ دیا گیا
وہ اس کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے
اُن کا رہنما مسیح نہیں تارا مسیح ہے
سنو! تمہاری بیٹی نے لاشوں کے کلر سلائیڈ جمع کئے ہیں
ان میں بوسنیا کے پھول جیسے بچے، خون کا غازہ
ملے بھوک سے مُرجھائے ہوئے، یتیم کشمیری نوزائدے
کہساروں پر پیدا ہونے والے
زخمی شیر خوار
صحرائے اعظم کے بجھے ہوئے لالۂ صحرا
مجھے خبر ملی ہے۔
تمہاری بیٹی گھر کے دیواروں سے
تمہاری تصویریں ہٹادی ہیں

تمہارا نامکمل بیاض
آدھے ادھورے مسودے
تمہارے میڈل
اور بہت سارے انعامات واسناد
کو ایک کچرے کے ڈبے میں ڈال دیا
اور پھر اس ڈبے کو آگ لگا دی
تمہارے جانے کے بعد ایک راہب
تمہارے گھر پر آیا
میں اس وقت تمہارے گھر کے آنگن
میں اپنے لئے قبر کھود رہا تھا۔
راہب نے مجھ سے پوچھا
مرتے وقت اس نے کوئی بات
کوئی شعر، یا مسکراہٹ ہونٹوں
پر رکھ دی تھی کیا؟
میں نے جواب دیا
اس نے مرتے وقت مجھ سے کہا
''میں اپنی تماسوچیں خونخوار دریا کی
طغیانی کو سونپ کر جا رہا ہوں''

☆☆

# بے بسی

تصرف میں میرے
زمین وزماں
لامکاں
کہکشاں
تصرف میں میرے،
زمینوں میں پوشیدہ اسرار پنہاں
خزینے زروسیم کے
ڈھیر لعل وگوہر کے
مگر بے بسی
آدمی کا کوئی راز
پہلے کھلا اور نہ اب کھل رہا ہے
وہی راز بستہ ہے
اسے کون کھولے؟

☆☆

# جنم دن کے بعد

گذشتہ مہینے کی چودہ کو میرا جنم دن پڑا تھا
وہی فروری کی دلاویز ٹھنڈک
وہی رات بھر رقص و نغمہ کی محفل
کسی نے میرے کان میں اپنے سانسوں کی
خوشبو بکھیری۔۔۔۔کسی نے میرے سر دشانے پہ
اپنی حنائی ہتھیلی کا کندن بکھیرا
کسی نے کہا۔۔۔۔''کس دہائی میں آئے''
کہا میں نے۔۔۔۔۔''ستر مکمل ہوئے ہیں''
یہ برسوں کی زنجیر شام و سحر
بدلتی رتوں کے در و بام پر
رات دن کا تسلسل۔۔۔۔
مجھے روک کر پوچھتا ہے۔''بتاؤ''
وہ راہیں کہاں کھو گئیں
جن پہ چل کر لہو لمس منزل کو تم پا گئے تھے
وہ بیدار راتیں کہ جن میں نہاں تھی
فضیلت کی وہ شب جو سب سے الگ ہے

بتاؤ کہاں ہے؟
وہ باران رحمت کہ جس کی طراوت سے
پیاسی زمینوں میں کیسر کے پھولوں کے گلشن سجے تھے
بتاؤ کہاں ہیں؟
تمنا کی راتیں۔۔۔۔
مُرادوں کے خوابوں کے بہتے جزیرے
جہاں تاب حوریں۔ 'پرندوں' پہ رقصاں
وہ شاہی بغیچے۔ پری محل کی شب
وہ 'روپ لانک' پر مے گساروں کے ڈیرے
وہ موسم جو زلفوں کی چھاؤں سے نکلے۔ طربناک
ثمر بار پیڑوں پر جانیں لٹاتے
مہ وسال کی دھند میں کھو گئے
وہ موسم۔ جو تپتی زمینوں کے خاطر
وہ موسم۔ مرادوں سے عاری۔ تمنا کے مرگھٹ پہ
لیٹی ہوئی بے کفن لاش جیسے
وہ موسم۔ بدلتے ہوئے رنگ وآہنگ کے قصے سناتے
کہاں چھوڑ آئے، ہمیں بھی بتاؤ
تو تب جا کے اپنا جنم دن مناؤ۔

☆☆

# شعلہ سیاہ پوش

سفید آکار کو چھو کر جانے لگا
تو برقعہ پوش خواتین کی دھکم پیل میں
گپھا کے دہانے سے لڑھک گیا
اور سیدھا، امراوتی کے زمہریری پانی میں جا گرا
سبز علی سکوتی کہتا ہے۔ کہ جب ایک
دشمن ایمان و آگہی نے چہرے سے نقاب سرکائی
تو پنج ترنی تک سورج کی کرنیں پانی کی
بوندوں میں جم کر موتی بن کر بکھرنے لگیں۔
میری آنکھیں چندھیانے لگی۔
روشنی کے پردے میں بشارت کے
چراغ بجھ گئے تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
درشن سے ڈرو۔ درشن موت کی نوید ہے۔
ان وادیوں میں بہت سے جیالے آئے۔
اور ہم سے آنکھ ملانے کی جستجو میں موت کے
گھاٹ اتر گئے۔ اب ان کی بے قرار روحیں

چشمۂ ششں مار۔ کے یخ بستہ کناروں پر بھٹک رہی ہیں۔
وادی سے نکل کر سبز علی سکوتی، جبلِ الرّحمہ
پر پہنچا۔ تو اسے جلب دیو دکھائی دیا۔
پھر اس نے شیطان پر نشانہ تاکہ۔ اور امراوتی سے جمع کئے ہوئے
سبز سیاہ، زرد اور تاریخی رنگ کے کنکر اس کے منہ پر دے مارے
اس سنگ ساری کے عمل سے فارغ ہو کر
اس نے مڑ کر دیکھا۔ تو لوگوں کی بھیڑ میں
ان گنت شیطان اس کی کھلی اڑا رہے تھے
اس نے اپنے حصے کے کنکر سمیٹ لئے اور بھیڑ میں گم ہو گیا۔۔۔
۔۔۔ سبز علی سکوتی یخ بست پانی میں مُراقبہ میں بیٹھا تھا
وہ اپنے غصے کی آگ بجھا رہا تھا
اتنے میں وہ خاتون آئی مادر زاد ننگی ہوئی، بال کھول دئے
بانہیں پھیلا دی اور پانی میں ڈبکی لگائی۔
سبز علی سکوتی نے آنکھیں بند کر دی
خاتون بول پڑی۔ وہ دل جو پاکیزگی کا مسکن ہو
وہ میرا نشانہ ہے۔ اس لئے کہ حسن غارت گرِ ایمان و آگہی ہے۔
سبز علی سکوتی خاموش تھا آنکھیں بند تھی
اتنے میں کسی نے دل پر دستک دی اور بولا
"عشق چہ داند جواں چہ پیر مرد
عشق بر ہر دل کہ زد تاثیر کرد

عشق را با کافری خویشی بود
کافری خود عین درویشی بود"
کچھ سمے بیت جانے کے بعد
جب وہ ٹھنڈے پانی سے باہر آئے
تو اس کے روئیں روئیں سے چنگاریاں
پھوٹ رہی تھیں۔
خاتون پانی سے نکل کر سورج کے سامنے سیس جھکائے
بال سکھا رہی تھی۔ سبز علی سکوتی سے اس نے جاتے ہوئے
کہا تھا۔ اسی چشمۂ ششمار میں محبت کا کھیل کھیلنے والے
برف کی طرح پگھل کر پانی میں تحلیل ہوئے تھے لیکن
جب میرے قہقہے کی کھنک سے دیوتاؤں کی نیند ٹوٹ گئی
تو وہ دوبارہ اپنے وجود میں داخل ہو گئے۔
پریشانی کے عالم میں جب میں اپنے بال بکھیرتی ہوں
تو سارا عالم ظاہر اندھیروں کی چادر تان لیتا ہے۔
سبز علی سکوتی غائب ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی آواز فضاؤں کو
چیرتی ہوئے خاتون کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہا تھا
"تم اپنے کالے پردے کی فکر کرو میں ظلمات کی تہو میں
روشنی کے ذخیرے ڈھونڈ رہا ہوں۔

☆☆

# بددعا

نور ہی نور ہو تم، میں ہوں اندھیروں کا رسول
تم سے بیزار نہیں
خود سے گریزاں ہوں میں
میں نے ظلمات کو سینے میں دبا رکھا ہے
روپ کی رانی، اندھیروں کا نگہباں ہوں میں
میرے کمرے میں کئی گھاؤ ہیں کروں کے ابھی
اِن کو دھو ڈالو
کہ بے داغ اندھیرا ہو جائے
روشنی بھول کے بھی آ نہ سکے آنگن میں
اسی خرابے میں کبھی پھر نہ سحر ہو جائے

☆☆

# مراسلہ (۲)

یہ کیسی صبح ہے بھائی
نہ مسجد سے اذاں آتی
نہ مندر شنکھ سے گونجا
نہ گربانی کی دُھن لئے ہے
نہ ہی اخبار آیا ہے۔ نہ بجلی ہے نہ پانی ہے
خدارا کچھ کہو
اس شہر کو کیوں سانپ سونگھا ہے؟

☆☆

# مراسلہ (۳)

یہ گلنار وادی
کبھی آتشِ گل سے دہکتی ہوتی تھی
یہ گلنار وادی
حسینوں کی سانسوں سے مہکتی تھی
یہ گلنار وادی
جہاں ہم ملے تھے
بہت خوبصورت، بہت دلنشیں تھی
ہواؤں میں تھا ذائقہ انگبیں کا
گلوں پر گذرتا گماں ساتگیں کا
یہ گلنار وادی
میرے من کے اندر تو عنبر فشاں ہے
مگر میرے باہر
وہ وادی نہیں، منجمد سا دھواں ہے
میرے دل میں پھر بھی وتستا رواں ہے
تیرے دل میں کیا؟

☆☆

# آئینے سے ڈرتا ہوں

خود سے روپوش اگر ہوتا تو اچھا ہوتا
خود سے اب آنکھ ملاؤں کیسے؟
جرم اپنوں سے چھپاؤں کیسے؟
میری ہر جرم کی یہ پل کے گواہی دیں گے
میرے مرجھائے ہوئے لب
یہ پھٹی سی آنکھیں
لاکھ الفاظ کو قابو میں رکھوں پر لہجہ
میرے اندر کے اندھیروں کو عیاں کر دے گا
میری بے وجہ خموشی کو بیان کر دے گا
دل کے درپن سے بھلا آنکھ چراؤں کیسے ؟؟

☆☆

# حسن برگزیدہ

وہ پرنور بزرگ
اور برگزیدہ شخصیت
میرے سامنے آئی
تو یوں محسوس ہوا
جیسے کسی معبد میں
سفید شمع روشن ہوئی ہو
وہ مسکرائی
تو یوں محسوس ہوا
جیسے چلۂ کلان کے سورج کی تمازت
اپنے آپ سے بیزار ہوئی ہو،
اس نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا
تو یوں محسوس ہوا
کہ منجمد پانی پر ایک برباد پن چکی ہلنے کی کوشش کر رہی ہے

☆☆

# ۱۹۸۴ء کی ایک شام

مجھے خبر ہے کہ
تو پہاڑوں کے زیرِ سایہ
سنہرے موسم کے زرد لمحوں سے
زندگی کی ہنسی چرا کر
سیاہ کمرے میں منہ چھپائے
سفید اندر سفید موسم کی منتظر ہے
تجھے خبر ہے کہ
میں سلگتی اداس شاموں کی نیم مردہ اجاڑ بستی میں
بے ارادہ
ہوا کے شانوں پہ ہاتھ رکھ کر
ردائے ابرِ رواں کو اوڑھے
تری فضا پر برس رہا ہوں
مجھے خبر ہے کہ
تو چناروں کے سرخ پتوں سے
جسم ڈھانپے
مجھے خلا میں چھپا رہی ہے

☆☆

# ایک احساس

سوچتا ہوں کہ دلِ زار کے صحراؤں میں
خود فریبی کے سمن زار بناتا جاؤں
حسرتِ وصل کی اجڑی ہوئی پیشانی پر
دستِ تخیل سے امید کا جھومر باندھوں

اپنے احساس کے مندر کا ہر اک دیپ بجھاؤں
اپنے جذبات کی شدت سے میں انکار کروں
اب میں اخلاص و مروت کا بھی دامن چھوڑوں
بھول کر بھی میں کسی سے نہ کبھی پیار کروں

بھول جاؤں کہ میرے واسطے ہوتی تھی کبھی
کوئی بیتاب نظر شام ڈھلے پنگھٹ پر
خود ہی تسلیم کروں ہاں نہیں رہتا تھا کبھی
منتظر کوئی میرا رات گئے چوکھٹ پر

جن کے ہاتھوں نے مجھے نشو و نما بخشی ہے
ان کے سینوں میں میرا کوئی بھی گوشا نہ رہا
جن کے رنگین سے خوابوں کا میں آئینہ تھا
ان کے نظروں میں میرا کوئی بھی کو نہ نہ رہا

بارہاں اپنے بزرگوں کو بھی یہ کہتے سُنا
جام ٹوٹے تو اسے پھینک دیا جاتا ہے
زینت خانہ وہی چیز ہے جو سالم ہے
گھر کی دولت میں اسی شے کو گنا جاتا ہے

مدتیں بیت گئی تیرا سہارا نہ رہا
کنج خلوت ہے وہی، میں بھی وہی دل بھی وہی
جانے کیا بات ہوئی کیوں ہوئے احباب خفا
کوچۂ یار وہی سر وہی، قاتل بھی وہی

☆☆

# ہم تم
(زبیر رضوی کے نام)

"ہمیں سے آباد انجمن ہے، ہمیں سے بزم وفا سلامت"
خلوصِ حسنِ نظر ہمیں سے، گلوں کی رنگیں قبا سلامت
رہے وہ گل پیراہن سلامت
ہے جس سے رنگِ چمن سلامت
لبوں کی لالی کے پھول مہکیں، رہیں وہ دست حنا سلامت
لہو جگر کا رواں رہے تو، مژہ کی ہر اک ادا سلامت
رہے گی دل میں چبھن سلامت
جو ہو وہ ناوک فگن سلامت
ہمارے ماتھے کی اک شکن سے، ادائے شمس و قمر سلامت
شبان ہجراں کی تیرگی سے، مزاجِ شام و سحر سلامت
ہمیں سے نظم ازل سلامت
ہمیں سے شامِ غزل سلامت
افق کی راہیں ہمیں سے روشن، ہمیں سے تاروں کے بن سلامت
یہ کہکشاں کی گلی میں رونق، وہ چاند کا سیمتن سلامت
یہ جلوہ گاہ قمر سلامت
وہ خواب گاہ مہر سلامت

ہمارے ذوق جنوں کے صدقے خرد کا دیوانا پن سلامت
اٹھاؤ سنگ گراں رفیقو، ابھی ہے اپنا بدن سلامت
رہیں گے دیوار و در سلامت
رہے گی آشفتہ سر سلامت
لٹاؤ موتیکے اب تلک ہے، ہمارا دامانِ تر سلامت
ملے گی خیرات چشم تر سے، رہے یہ دریوزہ کرسلامت
رہے دعا میں اثر سلامت
جو ہو جلالِ سحر سلامت
عرق عرق ہے جبین ساقی، رہے یہ تشنہ لبی سلامت
ابھی ہے پندار اپنا قائم، ہے اپنی غیرت ابھی سلامت
یہ دُرد نوشی رہے سلامت
یہ خرقہ پوشی رہے سلامت
رہین خواب گراں ہیں لیکن، ہمیں سے بیدار ریاں سلامت
گو تیرہ قسمت ہیں پھر بھی ہم، سے سحر کی تابانیاں سلامت
ہمیں سے آبادیں سلامت
ہمیں سے تنہائیاں سلامت
رہے گی بزم سخن سلامت، رہے جو اپنا بیاں سلامت
ملے گی دادِ سخن بھی ہم کو، رہے جو یہ قدرداں سلامت
جو تم سلامت تو ہم سلامت
جو ہم سلامت تو تم سلامت

☆☆

# میری بزمِ غم گُساراں

گئے موسموں کے ساتھی
تو متاعِ جاوداں ہے
کوئی فاصلہ نہ دُوری
تیرے میرے درمیاں ہے
میں دریاِ شب گزیدہ
تو چراغِ ضو فِشاں ہے

گئے موسموں کے ساتھی

شب و روز زندگی میں
تو قرار جان و دل ہے
تیری یاد ہے سہارا
غم اگرچہ جاں گُسل ہے
رخ شہر زادِ خُوباں
تیرے سامنے خجل ہے

گئے موسموں کے ساتھی

تو ہی حاصل سفر ہے
میری رہگزر کے راہی
مرے شوقِ بے ریا کی
ہے تجھی سے کج کُلاہی
میں فقیرِ عاشقی ہوں
تیری ٹھوکروں میں شاہی

گئے موسموں کے ساتھی

میرے ہم قدم مُسافر
مرے ہم نظر مُصور
تیرے خدو خال لے کر
جو رقم ہوئے مناظِر
سر شام جاگتے ہیں
وہی میری چشمِ نم پَر

گئے موسموں کے ساتھی

میری تیرہ وادیوں میں
تو شرار آگہی ہے
میں ردائے شہرِ ظلمت
تو نظر کی روشنی ہے
ترے حُسن کی شرافت
میرے شعر میں. ڈھلی ہے

گئے موسموں کے ساتھی

ہے جہاں میرا نشیمن
وہ شجروہ باغ تیرا
میری مَے کشی تجھی سے
مری مَے ایاغ تیرا
شب غم کی خلوتوں میں
میں ہوں بس سراغ تیرا

گئے موسموں کے ساتھی

تو نفس نفس میں پنہاں
تیرے دم سے دلربائی
شب و روزِ زندگی میں
میں اسیر خود ستائی
تو شریفِ کُنجِ عزلت
میں رذیلِ خود نُمائی

گئے موسموں کے ساتھی

میں فریب خود پرستی
تو یقینِ خود شناسی
میں گمانِ سوزِ ہستی
تو کمالِ بے نیازی
میں زوالِ دل نوازی
تو عروجِ جاں گزاری

گئے موسموں کے ساتھی

میرا غم تیری عنایت!
مری سر خوشی کی زینت
میں ہوں موجِ ناشناسی
تو ہے قلزمِ ولایت
تیرے ساتھ جو گزارے
وہی روز و شب غنیمت
تیری قربتیں بھی میری
تیری فرقتیں بھی میری

گئے موسموں کے ساتھی

# فردیات

جس جھیل کے آثار بھی معدوم ہوئے ہیں
اُس جھیل کے ساحل پہ ابھی تک میں کھڑا ہوں

☆

ہمیشہ سبز رہے تیری یاد کا موسم
بھلے ہی دل میرا گلشن میں یا قفس میں رہے

تیرے بدن کی مہک مجھ کو گھیر کر رکھ لے
تیرے خیال کی خوشبو نفس نفس میں رہے

☆

کنج زنداں ہے وہی شور سلاسل ہے وہی
آج سے پہلے جو تھی آج بھی مشکل ہے وہی

☆☆

# اشعار

تمام شہر میں خالی کہاں کوئی دیوار
میں اپنے نام کی تختی کہاں لگاؤں گا

نہ میرے ماتھے پہ کشکا نہ ہاتھ میں سبحہ
میں اپنے آپ کو کس کس سے اب بچاؤں گا

یہ جو بندگانِ نیاز ہیں، یہ تمام ہیں وہی عسکری
جنہیں زندگی نے اماں نہ دی، جو فرازِ دار نہ پا سکے

مدتوں بعد ملاقات ہوئی ٹھیک لگا
دل کی تھوڑی سی مدارت ہوئی ٹھیک لگا

درمیاں کوئی اشارا نہ ادا حائل تھی
آمنے سامنے ہی بات ہوئی ٹھیک لگا

☆☆

# کچھ نئے کچھ پرانے

☆ پروفیسر آل احمد سرور :

"آپ کی شاعری کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ آپ اس دور کے شعرا میں جدید حسیت اور موزون اظہار دونوں کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ جدید دور کے شعرا کا انتخاب میں آپ کا کلام ضرور شامل کرنا ہوگا۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی آپ کی شخصیت کی طرحداری اور بانکپن دونوں کی بھرپور عکاسی ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ آپکی غزل بہتر ہے یا آپ کی نظم۔"

☆ عمیق حنفی :

"یہ ایک ایسے شاعر کا مجموعہ ہے جو باوصف رومانی، پرتکلف اور نیاز مند نظر آنے کے کھرا ہے۔ اس کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔ ان میں دوئی نہیں، اس لیے کشمکش نہیں۔ اس کی لڑائی اپنے آپ سے ہے اس کا اندر اور باہر متوازی آئینے ہیں جن میں ایک ہی عکس بے شمار نظر آتا ہے۔

فاروق نازکی کی شاعری کی بناوٹ کشمیری غالیچے اور قالین کا ملفوظ اور مصوت نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس کا احساس نظموں کی ساخت اور غزلوں کی دروبست دیکھ کر ہوتا ہے۔

فاروق زبان پر قدرت رکھتا ہے، ایک شاعرانہ لہجہ رکھتا ہے اور ان تجربوں سے بھی مالا مال ہے جو اچھی شاعری کی جان بن جاتے ہیں اور پہچان بھی۔"

☆ محمود ہاشمی :

" فاروق نازکی کی غزل میں ایسے بے شمار اشعار ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد پہلا احساس تو یہ ہوتا ہے کہ نازکی نے جدید غزل کو اس منزل سے اپنا ہمنوا بنایا ہے جہاں ناصر کاظمی نے اسے چھوڑا تھا۔ دوسری بات جو نازکی کی غزل میں نمایا ہے وہ ہے ہیئت کی نئ ساخت۔ دو متضاد اور ناگفتہ مناظر، عوامل اور مفاہیم کے درمیان ایک نئے معنوی رشتے کی تشکیل۔ اس مقصد کے لیے فاروق نے کلاسیکی غزل یا جدید غزل کی رسمیات کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ ہر شعر کو مختلف رنگوں کی تیزی سے رقص کرتی ہوئی مشعل بنایا ہے۔ جس میں ابتدائی سطح پر رنگ الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے منفرد رنگ کے ساتھ نمایاں ہے۔ تب اس چکر ویوہ سے مفاہیم کا سر چشمہ طلوع ہوتا ہے اور فاروق نازکی انتہائی انوکھے، منفرد اور ہمہ جہت شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ غزل کی روایت اگرچہ پژمردہ اور پامال ہو چکی ہے، لیکن فاروق نازکی نے اسے اپنے اسلوب اور طرز فکر سے ایک نئ زندگی عطا کر دی ہے۔

فاروق کی ان غزلوں کی خصوصیات میں ان کی لفظیات سے ظہور و پذیر ہونے والا وہ Montage اور وہ Collage ہے جو شعر کی خارجی ہیئت کو اور الفاظ کو رنگ و آہنگ میں تبدیل کر دیتا ہے، جو اشعار درج کیے جا چکے ہیں اگر صرف ان کی لفظیات کو ہی پیش نظر رکھا جائے تو گہری نیلی شام، زلفوں کا دفتر، ہرے بھرے پتوں کی پیاس، صحرا صحرا، خون سمندر، بدن کی نگری، دیار خواب، جزیرہ نیند کا، یہ تمام عوامل جو Montage بناتے ہیں۔ ان میں تشکیل اور رد تشکیل کا فلسفہ اور Jacques Derrida کے تخلیقی اور تنقیدی افکار کی کسوٹی موجود ہے۔ "

☆ احمد مشتاق :

" فاروق نازکی کے شعروں میں معنویت، معصومیت اور قاری کے لئے کچھ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور ہوتا ہے جسے پڑھ کر بے ساختہ مُنہ سے یہی نکلتا ہے کہ یہ تو میرے دل

کی بات ہے۔ فاروق نازکی کے کلام میں جذبۂ احساس کی گھلاوٹ ہے۔ان کے لہجہ میں دردمندی کے ساتھ دبی دبی تلخی بھی موجود ہے۔ فاروق نازکی نے زندگی کے تجربات اور حادثات کو تشبیہہ و استعارہ کے وسیلہ سے شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔اس مجموعہ کے لیے فاروق نازکی کو دلی مبارکباد۔اوراس میں کوئی شبہ نہیں کہ عمر فرحت خود جتنے سنجیدہ شاعر و نقاد اور مدیر ہیں اتنی ہی سنجیدگی سے یہ مجموعہ ترتیب دیا ہے۔مبارک ہو۔"

## ☆ افتخار عارف :

"فاروق نازکی کی غزلیں ان لوگوں کے لیے مثالی ہیں جو غزل کے دو مصرعوں میں تنگی کا شکوہ کرتے ہیں کہ ان کی یہ ہنرمندی قابلِ داد ہے۔ فاروق نازکی کی غزلوں اور نظموں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ان کی شاعری میں تازہ فضاء بھی ملتی ہے اور فکر و اسلوب دونوں منفرد بھی ملتے ہیں۔ حالانکہ ان کی نظموں کی دنیا بہت حسین اور خوبصورت ہے۔اس مجموعہ کے لیے فاروق نازکی اور عمر فرحت کو دلی مبارکباد۔"

## ☆ پروفیسر حامدی کاشمیری :

"فاروق نازکی کی جمالیاتی شخصیت عہد رفتہ کے انسان کی مثالی شخصیت ہوتے ہوئے بھی حسیاتی بیداری اور تحرک کا پتہ دیتی ہے۔اس لیے آج کے انسان کے لیے بھی جاذب توجہ ہو جاتی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ وہ آج کے دور کے حیات شکن حالات سے بے خبر نہیں۔ فاروق نازکی خوابوں کو عزیز رکھنے کے باوجود حقیقت کی سنگینی کا احساس رکھتے ہیں۔وہ حقیقت سے ٹکرا کر مجروح بھی ہوتے ہیں، لیکن خوابوں کے دریچے کے تحفظ کے لیے اپنے دل و جان کو حصار بناتے ہیں۔وہ دل و جان پر وار سہتے ہیں، مگر خوابوں کی حفاظت کرتے ہیں۔خوابوں کے تحفظ کا یہ عمل جو رومانی ردعمل ہے، بہت کم شعرا کے یہاں ملتا ہے۔"

☆ امجد اسلام امجد :

"فاروق نازکی کا کلام گاہے گاہے نظر سے گذرتا تو رہا ہے مگر اس کا کوئی واضح اور مجموعی تاثر اس لیے قائم نہ ہوسکا کہ مسلسل رابطے کی کوئی صورت موجود نہیں تھی اور بھلا کرے برادرم ڈاکٹر لیاقت جعفری اور عزیزی عمر فرحت کا کہ ان کی کوشش اور وساطت سے ان کے اس شعری مجموعے کا مسودہ مجھ تک پہنچ سکا ہے جو اس وقت میرے ہاتھوں میں۔ اتفاق سے جس پہلے شعر پر میری نظر پڑی وہ ایک طرح سے شاعر، اُس کے طرزِ فکر اور قوتِ اظہار کا ایک مکمل تعارف اور ثبوت ہے کہ ان کے سارے کلام میں آپ کو اس کی بازگشت اور بوتلونی واضح طور پر سنائی اور دکھائی دیتی ہے کہ:

رنگوں کی گہرائی کا<br>
جھگڑا سب بینائی کا

ان کی زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں اور ان کی روانی اور نغمگی میں رنگوں کی یہ گہرائی آپ کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔

جھوٹی باتوں کی اترن<br>
بکتی ہے چوراہے پر

لکھ دے سب کچھ میرے نام<br>
دریا طوفان اور بھنور

اور پھر یہ کہ

پچھلی رت کا حال سنا<br>
اِس موسم کا نام نہ لے<br>
سات سمندر کا ہے سفر<br>
سست روی سے کام نہ لے

یہ کتاب ایسے ہی خوبصورت اور خیال افروز اشعار سے بھری پڑی ہے۔ میں اپنی اس بات کو مبا کباد اور دعا میں لپیٹ کر آپ کے اور شاعر کے درمیان سے ہٹتا ہوں کہ اچھی شاعری اپنا تعارف آپ ہوتی ہے۔ چلتے چلتے فاروق ناز کی ایک مختصر نظم ''دمِ رخصت'' کا ذکر البتہ ضروری ہے کہ یہ بیک وقت دل اور دماغ دونوں کو چھوتی اور مہکاتی ہے۔

گھر سے نکلا تو در و بام سے آئی آواز
اپنا کل چھوڑ کے کس حال میں رہنا ہے تجھے
راستہ دور تلک مجھ کو صدا دیتا تھا
تیرا فردا ہوں مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
آئینہ توڑ کے کمرے میں چلا آیا ہوں
چھوڑ کے خود کو ہر اک چیز اٹھا لایا ہوں

## ☆ شمیم حنفی :

''فاروق ناز کی خوبصورت محبت سے بھرپور جذبات کے شاعر ہیں جو زندگی بخش خیالات سے لبریز ہیں۔ ان کے لہجے میں مٹھاس ہے۔ ان کا دل محبت اور خلوص سے پُر ہے۔ اپنے محبت سے بھوپور شعروں میں وہ آج کے ذہین نوجوان نظر آتے ہیں۔ آج بھی ان کے یہاں فکر و فن کا دائمی ارتقاء ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے اسلوب کی شناخت کو برقرار رکھا ہے۔''

## ☆ زاہدہ حنا :

'' فاروق ناز کی کی شاعری وجدانی کیفیت کا اظہار ہے، یعنی جذبے کا حق اور اس کی صداقت ہے کہ دل کے محسوسات کو خوب صورتی سے بیان کرنے کا ہنر وہ جانتے ہیں اور حق بھی رکھتے ہیں۔ فاروق ناز کی زمین کی گہرائیوں میں پیوست پرا کرتوں کی جڑوں سے اپنی شعری زبان کو سنوارتے اور طاقت حاصل کرتے ہیں۔

☆ کبیر احمد :

''فاروق نازکی کے شعری سرمائے میں کیا نہیں ہے۔ وہ وقت، سماج اور گرد و پیش کی کسی بھی عمل، خوبی اور زہرناکی سے بے خبر اور بے حس نہیں۔ وہ خود دیکھتے ہیں محسوس کرتے ہیں اور پھر اپنے مخصوص انداز اور اثر پذیری کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے :

عجیب رنگ سا چہروں پہ بے کسی کا ہے
کبھی نہ بات زمانے نے دل لگا کے سنی
یہی تو خاص سبب میری بے دلی کا ہے

ان کی شاعری جدیدیت کی تمام خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ سماجی نابرابریوں کا علاج چاہتے ہیں اور سماجی تعصّبات کے خلاف ہیں اور جب زندگی کی بے اثری محسوس کرتے ہیں تو حکیمانہ کرتے ہیں ان کے فن میں عظمت اور شان اور اسلوب میں شیرینی اور روانی ہے۔''

☆ پروفیسر مظفر حنفی :

''گذشتہ کئی مہینوں سے میں غزل کی رنگارنگ اور پر پیچ دنیا کی سیاحت پر تھا یعنی ایک ادبی انجمن کے اصرار پر بیسویں صدی کے کم وبیش پچاس برسوں کی غزل کا ایک جامع انتخاب تیار کرنے میں مصروف تھا اور دنیا و مافیہا کے دوسرے کاموں کا ہوش بھی نہ تھا کہ وادی سے پہنچنے والی ایک دلدوز آواز نے مجھے نہ صرف چونکا دیا بلکہ گھنٹوں اپنی گرفت میں رکھا۔ یہ آواز فاروق نازکی کے مجموعۂ غزلیات نے مجھ تک پہنچائی تھی۔ تلخ، ترش، شیریں، لگا جیسے کوئی سوختہ گرد و پیش کے درمیان نوحہ کناں ہو۔ محسوس ہوا جیسے کوئی اپنی فردوس گمشدہ کی تلاش میں ہر آنے جانے والے سے استفسار کرتا ہو۔ عام طور پر چھوٹی چھوٹی بحروں لیکن نئی نئی زمینوں میں کہی گئی مختصر مختصر ان غزلوں میں، میں نے ایک ایسے جہان معنی کی سیر کی جس پر کسی دوسرے غزل گو کے قدم نہیں پڑے۔ ان شعروں کے مطالعے سے تخلیق کار کے

روحانی کرب، نفسیاتی پیچ وتاب، علوئے فکر، ترچھی اڑان اور شورش قلب کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اپنے اندر کے طوفان کو جس سہار اور سبھاؤ، جس ندرت اور جدت، جس مٹھاس اور رچاؤ کے ساتھ نازکی نے غزل کے پیرائے میں ڈھالا ہے اس کے نتیجے میں انتشار و شوریدگی کے پہلو بہ پہلو ان کے کلام میں عنایت اور تغزل بھی کم نہیں۔ اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔"

## ☆ رئیس الدین رئیس :

"فاروق نازکی کی شعری کائنات ادھوری نہیں ہے۔ اس میں رومانی جمال و جلال کی گلپوش وادیوں میں پیراہن حسن و جمال میں ملبوس فکر و جذبے کی مست خرام اور ازک اندام پریاں بھی گلگشت کرتی اور اپنے مدہوش کن جلوے لٹاتی نیز دعوت شوق دیتی نظر آتی ہیں۔ فاروق طبعاً ایک زندہ دل رومانی انسان ہیں، لہٰذا ان کی شاعری میں قلبی واردات اور نازک جذبات بھی دھڑکتے ہیں۔"

## ☆ کلیم حاذق :

" فاروق نازکی کی نظمیں بھی نہایت معیاری بامعنی اور موثر ہیں۔ علامت و استعارہ اور پیکر تراشی کے فن سے مرصع ان کی نظمیں "سنہری دروازے کے باہر، تیزاب آکارخوشبوکا" اور چلہ کلاں" پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ محمد فاروق نازکی کو غزل اور ن ظم پر یکساں عبور حاصل ہے اور بلاشبہ وہ ایک ایسے فنکار ہیں جنھوں نے سرمایہ ادب کو بہت کچھ دیا۔"

## ☆ رفیق شاہین :

"فاروق ایک حقیقت پسند شاعر ہیں، زمانے کے خارجی رجحانات اور پسماندہ حالات سے وہ بے خبر نہیں ہیں۔ انہیں نئی نسل کی تہذیب دشمنی قدروں کی پائمالی، رشتوں کی بے حرمتی، تنہائی، دربدری، بے چہرگی اور سماجی افراتفری کے عالم میں غیر محفوظ اور بے امن و

بے سکون زندگی کی موجودہ المنا کیوں کا بھی عرفان ہے اور بالخصوص وہ کشمیر کی شوریدگی اور اس کی پر آشوب صورتحال سے بھی بہرہ مند ہیں۔''

## ☆ لیاقت جعفری :

''فاروق نازکی شاعری میں عجیب وغریب پراسراری خوشبو ہے جو کہ پڑھنے سننے والوں کے ذہن و دل پر ایک الف لیلوی فضا طاری کر دیتی ہے جہاں قدم قدم پر یاد کی پریاں خوں کے معصوم فرشتے اپنی باہیں پھیلائے قاری کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ فاروق نازکی کے اشعار کو پڑھ کر کچھ ایسی مسرت اور انبساط کا احساس ہوتا ہے جیسے جاڑے کی منجمد کر دینے والی سردی میں ابر آلود آسمان کی پنائیوں میں گم روشن سورج یک بیک نکل آیا ہو۔''

## ☆ جاوید انور :

'' فاروق نازکی کے اشعار میں جو کشمکش اور آویزش نظر آتی ہے، اس کے پشت روایت کی ایک طویل تاریخ موجود ہے۔ ان کا کشمیری ذہن مجموعی طور پر جدید ہونے کے باوجود روایت کا خاصا اثر رکھتا ہے۔ اس میں ان کے قومی مزاج کا بڑا دخل ہے کہ صدیوں کے اثرات کے نتائج اتنی جلد زائل نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کا یہ رویہ آزادئ خیال کے تعلق سے جدید نسل اور قدیم نسل میں واقع خلیج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے تخلیقی وجود کی اہمیت کو منوانا نہیں ہے بلکہ ان کے اوپر جو سماجی، اخلاقی اور تہذیبی ذمہ داریاں ہیں، ان کو وہ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں تخلیقی معروضیت اپنی روایت کے ساتھ ساتھ مستعار اثباتی قدروں جن کی اصل روایتی قدروں کی تہہ میں ہی کہیں پوشیدہ ہیں، کو محض نقالی کے طور پر تصور نہیں کرتی بلکہ اسے روایتی قدروں سے منسلک کر کے سماجی اور معاشرتی ارتقا کے ایک سلسلے کی صورت میں برتتی ہے۔''

☆ عمر فرحت :

''یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے'' کی شاعری کے بارے میں مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ زندگی کا حقیقی تجربہ اور مشاہدہ جب شعور سے شعر میں آتا ہے تو بیشتر لکھنے والوں کا اسلوب تاثیر سے محروم اور سطحی ہونے لگتا ہے مگر فاروق نازکی اُن کم اہلِ قلم میں سے ہیں جنہوں نے اپنے گردوپیش دیکھے اور برتے ہوئے رنگوں کو یوں شاعری میں ڈھالا ہے کہ اُن کی چمک دمک مزید پُرکشش اور مرغوب ہوجاتی ہے۔ اُن کی متاعِ فکر نئے موضوع، تازہ احساس اور جدید لب ولہجہ سے عبارت ہے۔ فن سے بے لوث وابستگی نے انہیں ایسی دلکشی اور رعنائی عطا کی ہے کہ غزل اور نظم دونوں آئینوں میں وہ پوری آب وتاب سے دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔''
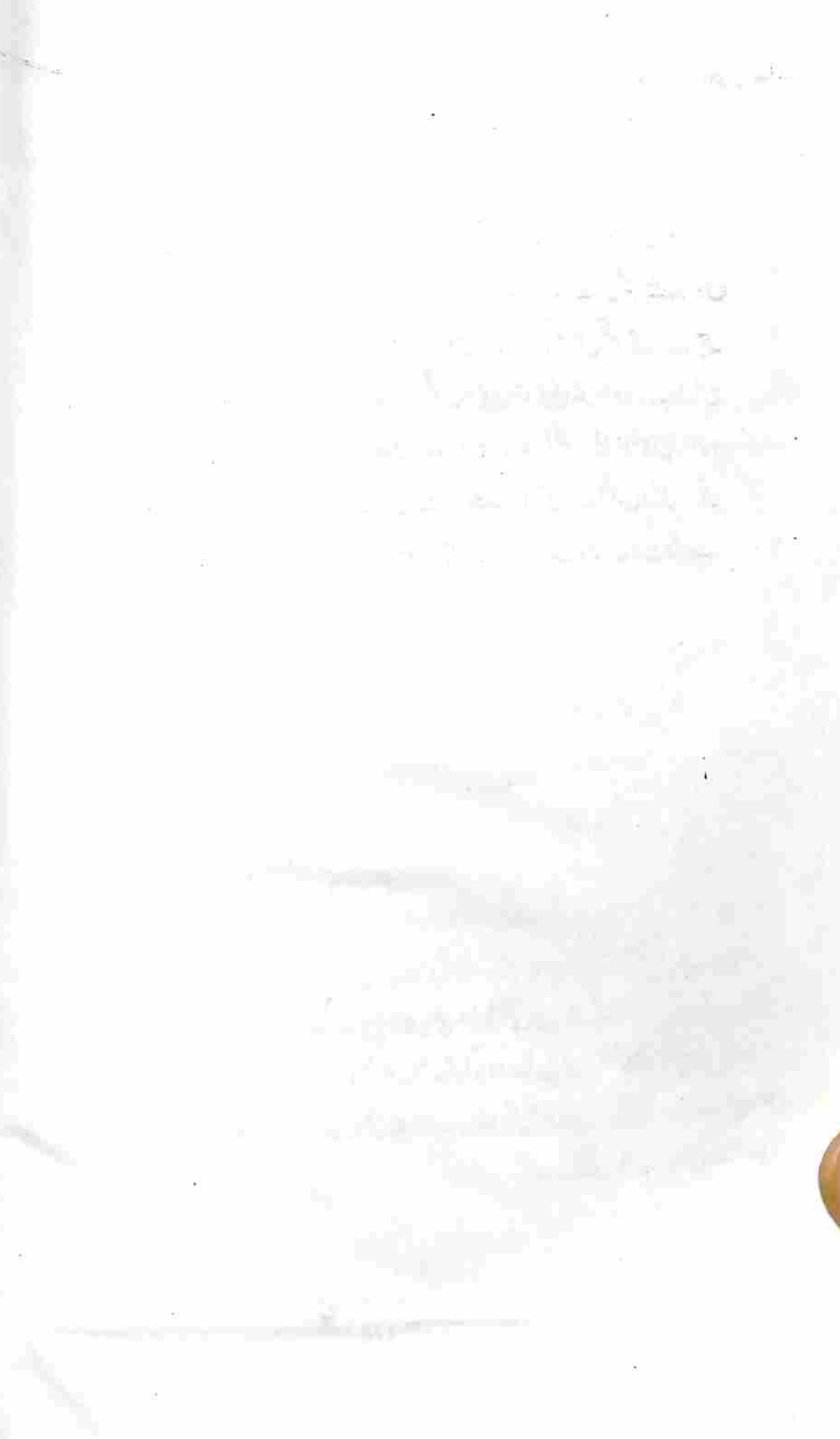
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

فاروق نازکی کا کلام میرا دیرینہ ساتھی رہا ہے، 'شب خون' کے دنوں سے میں انھیں جانتا ہوں۔ وہ صرف حادثوں یا سانحوں کے شاعر نہیں ہیں۔ وہ دیکھ کر اور سوچ کر کہتے ہیں، رواروی میں بات کہنا ان کا شیوہ نہیں۔ فاروق نازکی یہ بھی جانتے ہیں کہ سادگی میں پرکاری کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے۔ خارجی دنیا ان کے کلام میں منعکس ہے، لیکن براہ راست نہیں۔ ان کے یہاں ایک محزونی سی ہے جو گرد و پیش کے حالات ہی کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کے پر تفکر مزاج کی بھی آئینہ دار ہے۔ آج کل کے عام شعرا کے برخلاف، فاروق نازکی کے یہاں ترقی اور پختگی نظر آتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ ابھی ہمارے یہاں ایسے فنکار موجود ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ آباد

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

TAFHEEM PUBLICATIONS
تفہیم PUBLICATION
Opp. ITI. Road, Ward No. 04, Rajouri . 185131(J&K)